بھیڑیا، بدروح اور بیوی
انسانوں اور کُتوں کے شکار کی سچی اور سنسنی خیز کہانیاں
صابر حسین راجپوت
JBD Press

بھیڑیا، بدروح اور بیوی

انسانوں اور کتوں کے شکار کی سچی اور سنسنی خیز کہانیاں

صابر حسین راجپوت

جہانگیر بک ڈپو

لاھور، راولپنڈی، کراچی

فہرست

پیش لفظ

صابر حسین راجپوت کی آٹھ کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

صابر حسین راجپوت، ان کی شکاری ٹیم اور اس ٹیم کے کُتّے کسی تعارف کے محتاج نہیں اور ان کی کہانیوں پر تبصرے کی بھی ضرورت نہیں، پھر بھی دو چار باتیں اُن قارئین کے لیے ضروری ہیں جنہیں صابر حسین راجپوت کی کہانیاں پڑھنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہُوا۔

شکار کا نام سُنتے ہی نئے قارئین سمجھیں گے کہ یہ آدم خوروں کے شکار کی کہانیاں ہوں گی۔ ایسی ایک سو کہانیاں پڑھ لو تو بھی لگتا ہے جیسے ایک ہی کہانی سو بار پڑھی ہے۔ ان کے صرف کرداروں اور مقامات کے نام مختلف ہوتے ہیں۔

صابر حسین راجپوت کی کہانیوں میں آپ کو نہ کوئی شیر ملے گا نہ کہیں مچان باندھی جاتی ہے نہ بندوق چلتی ہے۔ اِن کہانیوں میں آپ کو صرف کُتّے اور ان کے مالک ملیں گے جو چند ایک نوجوان لڑکے ہیں۔ ان کا شکار خرگوش، گیدڑ، گوہ اور سیہہ ہیں۔ ان میں کوئی ایک بھی جانور آدم خور نہیں بلکہ درندہ بھی نہیں لیکن ان کا شکار آسان بھی نہیں۔ صابر حسین راجپوت کہتے ہیں کہ ان کا شکار لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ وہ اُس وقت نوجوان تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ فارغ رہ کر نظر بازی اور عشق بازی کا شغل شروع کر دیتے، اُنہوں نے اپنے گاؤں کے چند ایک نوجوانوں کی ایک شکاری ٹیم بنالی اور شکاری کُتّے رکھ لئے۔

مصنّف موصوف کی کہانیوں میں آپ کو صرف شکار نہیں ملے گا، اِن کہانیوں کے اندر کہانیاں ہیں جن کا تعلق انسانی جذبات کے ساتھ ہے اور ان کہانیوں میں انسانی فطرت کی پاکیزگی بھی ہے پراگندگی بھی۔ یہ وارداتیں اور واقعات بہت پُرانے ہیں لیکن یہ ڈرامے آج بھی کھیلے جاتے ہیں۔ اُس وقت کے بیشتر لوگ مرگئے ہیں

لیکن معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

صابر حسین راجپوت کی کہانیاں افسانے نہیں۔ یہ من گھڑت قصے نہیں، سچی کہانیاں ہیں۔ چونکہ یہ کہانیاں سچی ہیں اس لیے مصنف کی تحریریں سادگی اور بے ساختگی ہے۔ انداز شگفتہ ہے اور آپ کو مزاح بھی ملے گا۔

ہم صابر حسین راجپوت کی کہانیاں "حکایت" میں پھر کتابی صورت میں اپنے اس مشن کے تحت پیش کرتے ہیں کہ اپنے بچوں اور نوجوانوں کو اُن کہانیوں سے بچایا جائے جو ذہنی لذت، مار دھاڑ، جنسیت اور جرائم کی رغبت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس کی بجائے ہم ایسی کہانیاں پیش کر رہے ہیں جن میں کہانی کی تمام تر خوبیاں اور دلچسپیاں ہوتی ہیں لیکن ان میں ذہن کو خراب کرنے اور اخلاق کو تباہ کرنے والے واقعات نہیں ہوتے۔ آپ کے بچے بھی یہ کہانیاں پڑھ سکتے ہیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

جھلّا دُولہا

وہم سا ہوتا ہے جیسے لڑکپن اور نوجوانی کی یادیں ذہن سے مٹ گئی ہیں مگر کوئی اشارہ ملتا ہے تو آنکھ جھپکنے جتنے وقت میں وہ دَور ایک فلم کی طرح ذہن میں چل پڑتا ہے جب ہم نوجوان ہُوا کرتے تھے۔ دو تین دن گزرے میرے بڑے بیٹے نے ایک خبر سُنائی کہ ایک جوان عورت رات کے وقت بسوں کے اڈے پر اُتری اور جس محلّے میں اُسے جانا تھا اُس کا اُس نے کسی سے راستہ پوچھا۔ دو آدمی اُسے یہ جھانسہ دے کر اپنے ساتھ لے گئے کہ یہ محلہ قریب ہے اور وہ دونوں اُدھر ہی جا رہے ہیں۔ عورت اُن کے ساتھ چل پڑی اور دونوں آدمیوں نے اُسے ایک مکان میں لے جا کر اُس کی آبروریزی کی اور اُسے کہیں دُور لے جا کر چھوڑ دیا۔

اس سے پہلے میں ایسی خبریں پڑھ چکا تھا کہ شہر میں کہیں کوئی اکیلی دُکیلی عورت جاتی دیکھی تو اُسے پکڑ کر بے آبرو کر دیا گیا۔ پچھلے مہینے لاہور کی ایک خبر پڑھی تھی کہ امیر خاندانوں کے نوجوان شام کو کاروں میں گھومتے پھرتے ہیں اور بھکاری اور مزدوری کرنے والی نوجوان لڑکیوں کو کوٹھیوں میں نوکری دلانے کا دھوکہ دے کر کاروں میں بٹھا لیتے اور کہیں لے جا کر ان کی آبروریزی کرتے ہیں

اب میرے بیٹے نے مجھے ایک عورت کی بے حرمتی کی خبر سُنائی تو میرا ذہن بہت دُور پیچھے چلا گیا جب ہم نوجوان ہُوا کرتے تھے۔ ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی ہمیں ایسے ویرانے میں ملی تھی جہاں ہم جیسے مغرپھرے ہی جا سکتے تھے۔ وہاں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا اور میلوں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ میرے علاقے کے ویرانے ایسے ہیں کہ اونٹ اور

ہاتھی اِدھر اُدھر ہو جائیں تو پتہ نہیں چلتا کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

میں شاید ایسی ہی لڑکی کی ایک کہانی پہلے کبھی سنا چکا ہوں۔ اب یہ واقعہ یاد آگیا ہے۔ اُس روز ہمیں بڑی دُور کے شکار پر جانا تھا۔ اگر میں کہوں کہ وہ جگہ چودہ پندرہ میل دُور تھی تو آج کی نسل ہنسے گی کہ اس فاصلے کو میں بڑی دُور کہہ رہا ہوں۔ ہمارے پاس اُس وقت جیپیں اور سکوٹر نہیں تھے۔ ہم پیدل جایا کرتے تھے۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ ایک میل پانچ میل کے برابر ہوتا ہے۔ کبھی آپ گھاٹی اُتر رہے ہیں کبھی چڑھ رہے ہیں۔ کہیں آپ برساتی ندی نالے کے خشک پاٹ سے گزر رہے ہیں جہاں پاؤں ریت میں دھنستے ہیں۔

اگر ہماری ماؤں کو پتہ چل جاتا کہ ہم بھیڑیوں کے شکار کو جا رہے ہیں تو وہ ہمارا گھیراؤ کر لیتیں۔ پتھراؤ بھی کرتیں۔ وہ جب گالیوں کا فائر کھولتی تھیں تو ہمارے باپ بھی اِدھر اُدھر آڑ میں ہو جایا کرتے تھے۔ ان موسلا دھار گالیوں میں ہمارے کُتّے ہماری ماؤں کو اس طرح رحم طلب نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں — "ہم تو بے قصور ہیں نا! یہ ہمیں زنجیروں میں باندھ کر ساتھ لے جاتے ہیں" — ہماری ماؤں سے ہمارے کُتّے ڈرا کرتے تھے۔

میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں بتایا ہے کہ ہمارے علاقے میں کہیں کہیں بھیڑیئے ہُوا کرتے تھے۔ انہیں ہم اپنی زبان میں بھگیاڑ کہا کرتے تھے۔ رات کو کبھی کبھی دُور سے بھیڑیئے کی آواز آیا کرتی تھی۔ ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ پیدل سفر کرنے والوں کے لیے خطرہ بنتے۔ ایک روز کسی گاؤں کا ایک آدمی کہیں جاتے ہمارے گاؤں میں حُقّے کا کش لگانے کے لیے رُکا۔ اُسے حقّہ اور پانی پلایا گیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا گاؤں ایسی جگہ ہے جہاں ارد گرد کھڈ ہیں اور قریب سے ایک برساتی ندی رکتی، بھی گزرتی ہے۔ اس کے کنارے دیواروں کی طرح اُونچے ہیں۔ مٹّی کی ایسی دیواروں کو ہم اپنی زبان میں "ڈندیاں" کہا کرتے ہیں۔ ان میں ایک جگہ "پانی مار" کا راستہ تھا۔ یوں سمجھیں کہ یہ ایک غار کا دہانہ تھا جو بہت دُور اندر کو چلی گئی تھی۔ ایسی غاریں میری جوانی کے وقت عام نظر آتی تھیں۔

اس آدمی نے بتایا کہ اُس کے گاؤں کے قریب کہیں سے دو بھیڑیئے آگئے ہیں۔ ایک شام ایک آدمی ایک بھینس، دو بکریاں اور دو بیل واپس گھر لا رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا اس لیے وہ فاصلہ کم کرنے کے لیے برساتی ندی میں سے گزرا۔ اُن دنوں ندی خشک تھی۔ مویشی آگے جا رہے تھے۔ اچانک دو بھیڑیئے ندی کے بلند کنارے سے نکلے اور مویشیوں پر جھپٹ پڑے۔ مویشی بھاگ اُٹھے اور بکھر گئے۔ بھیڑیئے ایک بکری کے پیچھے گئے اور اسے پکڑ لیا۔ مویشیوں کا مالک بھی بھاگ گیا۔ اُس نے گاؤں میں جا کر سب کو بتایا۔ اُس کے مویشی خود ہی بھاگ دوڑ کر گھر پہنچ گئے۔ ان میں دودھ والی ایک بکری نہیں تھی۔ صبح گاؤں کے چند ایک آدمیوں نے وہاں جا کر دیکھا۔ "ڈندی" میں جہاں "پانی مار" کا دہانہ تھا وہاں بچی کھچی بکری پڑی تھی۔

چار پانچ دنوں بعد تین شُتربان اِدھر سے گزرے۔ اِن کے ساتھ ایک کُتّا تھا۔ بھیڑیئے انسان پر اور اُونٹ جیسے بڑے جانور پر حملہ نہیں کیا کرتے۔ دو بھیڑیئے اچانک نکلے اور کُتّے کی طرف گئے جو شتربانوں اور اُونٹوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ کُتّا لڑاکا یا شکاری نہیں تھا، ورنہ مقابلہ کرتا۔ وہ بھاگ نکلا۔ بھیڑیئے اس کے پیچھے گئے۔ اُنہوں نے کُتّے کو زیادہ دُور نہ جانے دیا۔ اسے پکڑا اور بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر مار ڈالا۔ شُتربان دُور کھڑے دیکھتے رہے۔ ایک بھیڑیئے نے مرے ہُوئے کُتّے کو منہ میں لیا اور اسے گھسیٹ کر "ڈندی" کے غار کے سامنے جا پھینکا پھر دونوں اسے کھانے بیٹھ گئے۔

اس آدمی نے جو ہمارے گاؤں میں رُکا تھا، بتایا کہ لوگوں نے اُدھر سے گزرنا چھوڑ دیا ہے۔

اُس نے یہ بھی بتایا کہ بھیڑیوں کو شکار نہیں ملتا اِس لیے رات کو گاؤں کے قریب آجاتے ہیں لیکن گاؤں میں رکھوالی والے تین خونخوار کُتّے ہیں۔ انہیں بھیڑیوں کی آواز سنائی دیتی ہے تو اُن کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ بھیڑیئے بھاگ جاتے ہیں۔

ہم نے اس آدمی سے اس کے گاؤں کا نام اور راستہ پوچھ لیا۔ ہم دوسرے

دن ان بھیڑیئوں کے شکار کو روانہ نہ ہو سکے کیونکہ گاؤں میں ایک عورت مرگئی تھی ہم اس کے کفن دفن کے انتظام میں لگ گئے۔ ماتم کے فوراً بعد شکار پر جانا مناسب نہ سمجھا۔ ہم چوتھے دن روانہ ہوئے لیکن پوری پارٹی ساتھ نہیں تھی۔ ہم چار لڑکے اور چار ہی کُتّے تھے۔ چاروں شکار کے ماہر اور خونخوار تھے۔ ماؤں کی گالیوں اور باپوں اور دادوں کی مسکراہٹوں نے ہمیں رخصت کیا۔ ہم حسبِ معمول پَیدل جا رہے تھے۔ ہمیں چودہ پندرہ میل دُور جانا تھا۔ ہم اگر سیدھے راستے سے جاتے یعنی وہ راستہ اختیار کرتے جو اُس گاؤں کی طرف جاتا تھا تو فاصلہ لمبا ہو جاتا۔ ہم کھڈ نالے پھلانگتے گئے۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم شکاری تو تھے لیکن شکار کے متعلق ایسے سنجیدہ نہیں تھے کہ جہاں جانے کا ارادہ کیا ہے وہیں پہنچیں اور جس شکار کے پیچھے جانے کا ارادہ تھا اُسی کے پیچھے جائیں۔ جاتے جاتے ہمیں ہمارے راستے میں کوئی اور دلچسپی مل جاتی تو ہم اس میں مگن ہو جاتے تھے۔ صرف یہ خیال رکھتے تھے کہ دلچسپی مردوں والی ہو۔ بیٹھ کر گپ مارنے کو یا تاش کھیلنے کو ہم گناہ سمجھتے تھے۔ ہمیں شکار کے اصول اور طور طریقے جو میں نے بہت بعد میں کتابوں میں پڑھے اور سُنے تھے، معلوم ہی نہیں تھے۔ طور تو مجھے اب بھی معلوم نہیں طریقے ہم اپنے اختیار کیا کرتے تھے۔ اُس روز ہم دو بھیڑیئوں کو مارنے جا رہے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ بھیڑئیوں کو ان کی کچھار سے باہر کس طرح نکالا جاتا اور ان پر کُتّے کس طرح چھوڑے جاتے ہیں۔

راستے میں ہمیں بڑی خوفناک دل چسپی مل گئی۔ ہم نے کُتّوں کو کھُلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ تقریباً ایک سو گز دُور سے ایک اُونٹ زمین سے اُبھرا اور بہت تیز دوڑتا ہماری طرف آیا۔ کُتّے ہم سے آگے تھے۔ ہمارے ایک دوست نے کہا کہ یہ اُونٹ مست معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ ہر طرف سڑکیں نہیں لے جائی جا سکتیں۔ اُس وقت تو کچی پگڈنڈیاں تھیں۔ زمین کھڈ نالوں، ٹیلوں اور گھاٹیوں کی تھی اس لیئے ہاں کی ٹرانسپورٹ اونٹ تھے اور گدھے۔ ایک ایک شُتربان کے کئی کئی اُونٹ

ہوتے تھے۔

ان اونٹوں میں کبھی کبھار کوئی اونٹ مستی میں آجاتا تھا۔ اس کی حالت باؤلے کُتّے جیسی ہو جاتی تھی۔ ہر کسی کو کاٹتا تھا۔ اپنے مالک کا بھی دشمن ہو جاتا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ گرتی تھی جو اس کی بدمستی کی نشانی ہوتی ہے۔ یہ اونٹ جو گھاٹی چڑھ کر ہماری طرف دوڑا آ رہا تھا مست معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے منہ سے بڑی غصیلی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ ہمارے ایک کُتّے کی طرف دوڑا۔ کُتّا اُس کے مقابلے میں آگیا۔ دوسرے کُتّوں نے دیکھا تو وہ بھی اونٹ پر حملہ کرنے کے لیے اُس کے اِردگرد دوڑنے لگے۔

ہمیں دُور سے آوازیں سنائی دیں — "آگے نہ ہونا اُونٹ مست ہے۔ کُتّوں کو ہٹا لو"۔

اُدھر دیکھا۔ تین آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اُٹھائے دوڑے آ رہے تھے۔ اُونٹ انہی کا تھا۔ ہم کُتّوں کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو ہمیں خطرہ نظر آیا۔ اُونٹ رُک کر اور مُنہ نیچے کر کے کُتّوں سے نہ صرف بچنے کی بلکہ کُتّوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی حرکتوں میں اب قہر اور غضب بھر گیا تھا۔ کُتّے بھی غصّے میں آگئے تھے۔ ایک کُتّا اُونٹ کی زد میں آگیا۔ اُونٹ نے اُس کی دم مُنہ میں لے لی اور اُسے اُٹھا کر اُوپر لے گیا اور زمین پر پٹخ دیا۔ باقی کُتّے ڈر کر بھاگنے کی بجائے اُچھل اُچھل کر اونٹ کی ٹانگوں پر منہ ڈالنے کی کوشش کرنے لگے۔ جس کُتّے کو اونٹ نے پٹخ دیا تھا وہ تو اونٹ پر اتنا اچھلتا تھا جیسے اُس کی گردن میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

شُتربان بھی آگئے تھے۔ اُن کے پاس ایک رسّہ تھا۔ ایک کے پاس کوئی آدھ گز لمبا اور دو انچ موٹا بانس کا ٹکڑا تھا جو ایک طرف سے کھُلا اور دوسری طرف سے بند تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی بنائی ہوئی کوئی دوائی ڈال رکھی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ اُونٹ کو گرا لیں اور بانس کے اس "نلکے" سے اس کے حلق میں دوائی انڈیل دیں۔ ایسی دوائی میں سبز دھنیا رگڑ کر ڈالتے ہیں۔ یہ بدمست جانور کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

شتربان اونٹ کو روکنے کی اور ہم کُتّوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُونٹ اکیلا سب کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس افراتفری اور بھاگ دوڑ میں ہمارا ایک دوست افضل اُونٹ کے سامنے آگیا اور اُونٹ نے اُسے پکڑنے کے لیے منہ اُس کی طرف کیا۔ افضل بھاگ اُٹھا۔ اُونٹ اُس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ اونٹ گھوڑے کی رفتار سے دوڑتا ہے۔ یہ تو مست اونٹ تھا۔ اس کی رفتار نے ہمیں حیران کر دیا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ افضل اُونٹ سے بچ جائے گا۔

کُتے اونٹ کے ساتھ ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔ ہم اور شُتربان اونٹ کی رفتار سے نہیں دوڑ سکتے تھے۔ کُتے اونٹ کی ٹانگوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں افضل کا بُوہلی (بُل ڈاگ) بھی تھا جو بہت ہی خونخوار اور طاقتور کُتا تھا۔ اس نے اونٹ کی اگلی ٹانگ پر منہ ڈال لیا لیکن دوڑتے اُونٹ نے اسے اس طرح دُور پھینک دیا جس طرح فٹ بال کو کِک لگائی جاتی ہے۔ ہم چاروں دوستوں کی پریشانی کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ افضل جیسا خوبصورت نوجوان اور ہمارا بڑا ہی پیارا اور زندہ دِل دوست ہمارے سامنے موت کے منہ میں جا رہا تھا۔

افضل پھرتیلا تھا۔ ہم اُونٹ کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ ہمارے ایک اور دوست شہباز نے چلّا کر کہا — "اچھو! فوراً مڑو" — افضل فوراً دائیں کو مُڑا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اونٹ بھی اسی تیزی سے مُڑا اور اس نے افضل کا تعاقب نہ چھوڑا۔ ہم نے آگے ہو کر اُونٹ کو روکنے کی کوشش کی لیکن اونٹ اتنی تیزی سے ہمارے درمیان سے گزر گیا جیسے بس پوری رفتار سے گزر گئی ہو۔ افضل اور اُونٹ کے درمیان فاصلہ آٹھ دس قدموں کا رہ گیا تھا۔

افضل آخر اتنی تیز کب تک دوڑ سکتا تھا لیکن اُس نے دماغ حاضر رکھا۔ اُس نے ایسی سمت رُخ کر لیا جدھر ایک اور خطرہ تھا۔ میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں کئی بار بتایا ہے کہ ہمارے علاقے میں ایسی جگہیں عام ہیں کہ آپ چلے جا رہے ہیں اور آگے زمین ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ کو آپ کئی منزلہ اُونچے مکان کی

منڈیر پر کھڑا پاتے ہیں۔ یہ ایک دیوار (دندی) ہوتی ہے جس کی بلندی ڈیڑھ سو فٹ سے کچھ کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے نیچے ویران اور بنجر زمین ہوگی یا یہ برساتی ندی نالہ ہوگا۔

افضل جدھر جا رہا تھا، اُدھر نیچے برساتی نالہ تھا۔ شتربانوں کو معلوم تھا کہ آگے بڑی اُونچی دندی ہے جہاں سے افضل گِرا تو اِس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ اِن دندیوں میں ایک خطرہ اور بھی ہوتا ہے۔ یہ چونکہ مٹی کی دیواریں ہوتی ہیں اس لیے ان کے تودے بھی ہوتے ہیں جو ان کا حصّہ بنے رہتے ہیں لیکن ذرا سے دھکے سے کوئی ڈھیلا تو وہ الگ ہو کر گِر پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں کہ کسی نے دندی کے دامن سے مٹی کھود دی اور اُوپر سے کئی من تودہ اُوپر آگرا۔ اس کے نیچے دب کر موت یقینی ہوتی ہے۔

افضل اُدھر جا رہا تھا۔ شتربانوں نے چلّا چلّا کر کہا — "آگے نہ جانا اوئے آگے نہ جانا اوئے" — لیکن وہ جگہ دُور نہیں تھی۔ افضل آگے چلا گیا تھا۔ ہم سب چلّانے لگے لیکن افضل تک جیسے ہماری آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ زندگی اور موت میں پُورے ایک منٹ کا بھی وقفہ نہیں رہ گیا تھا۔ افضل زندگی کے آخری قدم تک جا پہنچا اور وہاں سے وہ یکلخت بائیں کو مڑ گیا۔ اُس کا پاؤں پھسلا۔ اُس کا ایک ہاتھ زمین پر جا لگا۔ وہ سنبھل گیا۔

اونٹ کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ ہم نے بعد میں دیکھا کہ افضل دندی کے عین کنارے سے مڑا تھا۔ اُونٹ سیدھا چلا گیا اور مُڑا لیکن یہ بہت بڑا جانور تھا۔ اُس کا اگلا قدم کنارے سے آگے پڑا جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ پلک جھپکتے اونٹ غائب ہو گیا جیسے اُسے زمین نے نگل لیا ہو۔ افضل نے پیچھے دیکھا۔ اونٹ اُسے نظر نہ آیا۔ وہ گِر پڑا اور پیٹھ پر لیٹ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ ہندوؤں کی طرح جوڑ کر آسمان کی طرف کر دیئے۔ ہم دوڑ کر اُس تک پہنچے۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح اُٹھ بیٹھ رہا تھا۔ سانسیں مل نہیں رہی تھیں لیکن وہ ہنس رہا تھا۔

کُتّے دندی کے اوپر کھڑے نیچے دیکھتے اور بھونکتے تھے۔ ہم نے جا کر دیکھا اونٹ ایک پہلو پر پڑا اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس سے اُٹھا نہیں

جا رہا تھا۔ اتنی بلندی سے گر کر ایک تو اُس کی مستی ہوا ہو گئی تھی اور دوسرے اُس کی کوئی کل سیدھی ہو گئی تھی جو اُسے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ شُتربان نیچے چلے گئے۔ ہم نے جب دیکھا کہ افضل بالکل ٹھیک ہے تو ہم بھی کچھ دُور جا کر نیچے گئے اور اُونٹ کو دیکھا۔ اُس کے منہ سے خون نکل رہا تھا اور پچھلی ٹانگ کی ہڈی اس طرح ٹوٹی تھی کہ ایک ٹوٹا ہُوا سرا کھال پھاڑ کر باہر نکل آیا تھا شتربان کہتے تھے کہ اسے اندرونی چوٹ بھی آئی ہے جس سے یہ جانبر نہیں ہو سکے گا اور جب یہ مر جائے گا تو وہ اس کی کھال اتار کر لے جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھاگتے چور کی لنگوٹی اتارنے کے لیے بیٹھ گئے۔

ہم ذرا سستانے کے لیے ان کے پاس بیٹھ گئے۔ کُتے اب بھی اونٹ پر بھونکتے تھے لیکن ہمارے اشاروں پر وہ سمجھ گئے کہ دشمن اب لڑنے کے قابل نہیں رہا۔ شتربان ہمارے کُتوں کی تعریفیں کرنے لگے ہم نے انہیں بتایا کہ یہ شکاری کُتے ہیں اور ہم دو بھیڑئیوں کو کُتوں سے مروانے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ یہ دو بھیڑئیے مویشیوں پر حملہ کرتے ہیں اور یہ دن بدن فلاں گاؤں کے لیے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔

”وہ بھیڑئیے مارے جا چکے ہیں“ ——— ایک شتربان نے کہا ——— ”انہیں کل صبح ایک صوبیدار نے دونالی بندوق سے مارا ہے۔ وہ کسی اور گاؤں کا رہنے والا ہے اور چھٹی آیا ہُوا ہے۔ اُسے ان بھیڑئیوں کا پتہ چلا تو صبح صبح اُس گاؤں میں آ گیا جس کے آس پاس رات کو بھیڑئیے آیا کرتے تھے۔ اُسے وہ جگہ دکھائی گئی جہاں ایک گُف (غار) ہے۔ ایک بکری کی سِری اور ہڈیاں اِس گُف کے آگے ابھی تک پڑی تھیں۔ بھیڑئیوں نے ہمارے شتربانوں کا کُتا بھی کھا لیا تھا۔ صوبیدار نے دندی میں پانی مار کی وہ گُف دیکھی تو اُس نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ایک بھیڑ یا بکری لے آئیں اور گُف کے سامنے دس بارہ قدم دُور باندھ دیں“۔

انہوں نے بتایا کہ بکری کے ایک بچے کو لے آئے اور خشک ندی میں باندھ دیا۔ صوبیدار اسی دندی پر چڑھ گیا جس میں گُف تھی۔ دندی کے درمیان میں ہی اُسے بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ وہاں بہت بڑا ایک تودہ تھا۔ صوبیدار اس کے ساتھ

لگ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ وہاں سے دُور چلے جائیں۔ لوگوں کے ہٹنے کی دیر تھی کہ دونوں بھیڑئیے باہر نکل آئے۔ بکری کے بچے نے شاید بھیڑئیوں کی بُو پا کر پہلے ہی ممیانا شروع کر دیا تھا۔ بھیڑئیے اس کی آواز پر جلدی نکلے ہوں گے وہ اناڑی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو سے لگے آہستہ آہستہ بکری کے بچے کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اوپر مارشل لاء بیٹھا ہُوا ہے۔ فاصلہ بڑا تھوڑا تھا۔ صوبیدار نے یکے بعد دیگرے دونوں نالیوں کے کارتوس فائر کر دیئے۔ دونوں بھیڑئیے کچھ دیر تڑپے اور مر گئے۔

ہمارا شکار مارا جا چکا تھا۔ دوستوں نے کہا کہ چلو مرے ہوئے بھیڑئیے دیکھ آتے ہیں۔ وہ گاؤں ابھی کم و بیش چار میل دُور تھا۔ شتربانوں نے بتایا کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ بے شک اِدھر سے گاؤں قریب پڑے گا لیکن علاقہ بہت خراب ہے۔ ہم اس سے پہلے اِدھر کبھی نہیں آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیلے اور گھاٹیاں بہت ہیں اور کھڈ نالے زیادہ ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اُوپر نیچے چڑھتے اُترتے ہم تھک کر چُور ہو جائیں گے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ تھک کر چُور ہونے کا شوق ہی ہمیں ان کھڈ نالوں اور گھاٹیوں میں لے آتا ہے۔ شکار کُتے کھاتے ہیں۔ ہم تو گھر سے لائے ہوئے پراٹھے کھا کر اور پسینہ بہا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

ہم اسی دشوار اور تھکا دینے والے علاقے سے گذرنے کے لیے چل پڑے ہمارا ارادہ شکار کھیلنے کا بھی تھا۔ کوئی دو میل گئے ہوں گے کہ ہم ایک گھاٹی اُتر رہے تھے۔ ہم ایسی جگہ اُتر گئے جہاں مٹی کے ٹیلے بہت چوڑے اور گول ستونوں کی طرح کھڑے تھے۔ نیچے اور اوپر درخت بھی تھے۔ شہباز نے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اُسے ایسے لگا ہے جیسے ایک عورت ہمیں دیکھ کر اُدھر چھُپ گئی ہے۔

ہم حیران نہ ہوئے کیونکہ اس سے پہلے ہمارے ساتھ اس طرح کے واقعات پیش آ چکے تھے۔ ایسے واقعات جیسے میں آپ کو سناتا رہتا ہوں، اُن کو حیران کرتے ہیں جو گھروں سے باہر نکل کر ہماری طرح دنیا کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے کھڈ نالوں

اور ویرانوں میں گھوم پھر کر دیکھا ہے۔ چور، ڈاکو، رہزن اور دوسرے گناہگار ایسے ہی علاقوں میں چھپا کرتے تھے۔ گناہ کرنے والوں کے لیے یہ جگہیں دنیا کی نظروں سے دُور اور محفوظ تھیں۔ لوگوں کو نظر آنے والی چڑیلیں بھی ایسے ہی علاقوں میں نظر آیا کرتی تھیں۔ جن بھُوت بھی ایسے ہی علاقوں میں رہتے تھے۔ سنسنی خیز اور ناقابلِ فراموش بلکہ شہروں میں رہنے والے لوگوں کے لیے ناقابلِ یقین کہانیاں انہی علاقوں میں ملا کرتی تھیں۔ ان ڈھکے چھپے علاقوں میں کبھی کبھی کوئی لاش بھی پڑی ملتی تھی۔

اب شہباز نے ہمیں بتایا کہ اُسے ایک اور عورت کی جھلک نظر آئی ہے تو ہم اور تیز چل پڑے۔ اگر وہ واقعی عورت تھی تو ضرور کوئی بات تھی۔ یہ گذرگاہ نہیں تھی۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہیں تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ کوئی آدمی بھی ہوگا۔ ہم چلتے گئے۔ اب وہ مجھے نظر آئی۔ وہ جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے ایک ٹیلے کی اوٹ سے ہمیں دیکھا اور ٹیلے کی اوٹ میں ہوگئی۔ میں نے سب کو بتایا۔ ہم چاروں دوست بکھر کر ٹیلوں کے درمیان سے گذرتے اس طرح آگے بڑھنے لگے کہ وہ جو کوئی بھی ہو اُسے گھیر لیا جائے۔

وہ ایک بار پھر دکھائی دی۔ اب ہماری طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ وہ بھاگی جا رہی تھی۔ ہم نے اُسے رُکنے کو نہ کہا کیونکہ خیال یہی تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی آدمی ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ ہو اور یہ لوگ اِدھر سے گزر رہے ہوں اور کہیں ستانے بیٹھ گئے ہوں۔ بہرحال ہم اُس کے پیچھے جاتے رہے۔ وہ ایک بڑے ٹیلے کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔ ہم اور تیز ہو گئے۔ وہ پھر دکھائی دی اور فوراً ہی غائب ہوگئی۔

"یہ کوئی اور معاملہ ہے" —— ہمارے ایک دوست نے کہا۔ "اسے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے!"

ہم اُس طرف گئے جدھر وہ غائب ہوگئی تھی۔ اب وہ ہمیں صاف نظر آگئی۔ وہ رُکی کھڑی تھی اور اُس کا منہ ہماری طرف تھا۔ وہ ایسی جگہ تھی جس کے دائیں اور بائیں مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں اور کوئی بیس بائیس قدم آگے یہ جگہ بند

ہوگئی تھی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک طرف سے بند گلی تھی۔ لڑکی کو معلوم نہ تھا کہ یہ آگے سے بند ہے ورنہ اس میں داخل نہ ہوتی۔

وہ تو نوجوان لڑکی تھی اور بہت خوبصورت۔ کپڑوں سے وہ غریب لگتی تھی۔ اگر اُس نے شہری اور فیشنی لباس پہنا ہُوا ہوتا تو کوئی نہ کہتا کہ یہ دیہاتن ہے۔ اُس کے چہرے پر خوف تھا۔ ہم جوں جوں اُس کے قریب ہوتے جاتے تھے وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتی جاتی اور خوف سے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آتے جا رہے تھے۔ وہ پچھلی دیوار کے ساتھ جا لگی اور ایک طرف سرکنے لگی۔ اُس نے اپنے ایک ہاتھ کی اُلٹی طرف اپنے منہ پر رکھ لی۔

"میں اکیلی ہوں" —— اُس نے خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں روتے ہوئے کہا —— "خدا سے ڈرو۔ مجھ پر پہلے ہی بہت ظلم ہُوا ہے.... تم چار ہو۔ تمہیں اپنے اللہ کا واسطہ، مجھے جان سے مار دو۔"

بڑا ہی خوبصورت شکار تھا۔ ہم چاروں جوان تھے۔ ہمیں مائیں غصّے میں آکر کہا کرتی تھیں —— "تمہاری جوانی پھٹی جا رہی ہے۔ خدا سے ڈرو اور اِن کُتوں کی یاری چھوڑ دو" —— یہ غلط نہیں تھا۔ ہماری جوانی پھٹی جا رہی تھی اور اُس ویرانے میں اس لڑکی کا شور و غوغا سُننے والا کوئی نہ تھا لیکن ہم کاروں والوں کے بیٹے نہیں تھے۔

"مت ڈرو لڑکی!" —— شہباز نے کہا۔ "ہماری نیّت پر شک نہ کرو۔ آگے آؤ اور بتاؤ یہاں کیوں آئی ہو۔"

"تم چلے جاؤ" —— اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہیں رہنے دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو" —— ہم اُس کے قریب جا رُکے۔ اب تو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اکیلی ہے۔ ہم اُسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بار بار پوچھنے کے باوجود اُس نے نہ بتایا کہ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔

"کوئی ٹونہ کرنے آئی ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

ہمارے علاقے کے پیر اور عامل جو عموماً شاہ جی کہلاتے ہیں آج بھی لوگوں کو، خصوصاً عورتوں کو عجیب و غریب ٹُونے بتایا کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں

جو خشک نالے (کسّی) کے کسی خاص مقام پر کیے جاتے ہیں یا ایسے ویرانے میں جہاں ہم اس لڑکی کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کوئی ٹونہ کرنے آئی ہے تو اُس نے سر ہلا کر کہا ــــ "نہیں ..... تم سب چلے جاؤ۔"

"ہم نہیں جائیں گے" ــــ ہمارے ایک دوست نے کہا "بتا دو یہاں کیا کرنے آئی ہو تو ہم چلے جائیں گے ..... گھر سے بھاگ آئی ہو؟"

"نہیں" ــــ وہ اور زیادہ رونے لگی "تم چلے جاؤ۔"

"اس کی تلاشی لو یارو!" ــــ افضل نے کہا ــــ "کسی کی نوکرانی لگتی ہے۔ چوری کر کے بھاگی ہے۔"

"لے لو تلاشی میری" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں کسی کی نوکرانی نہیں۔ میں تو خود لُٹ گئی ہوں۔"

شہباز کو ہم اپنا لیڈر سمجھا کرتے تھے۔ اُس میں تھوڑی سی عقل ہم سے زیادہ تھی۔ آج میرے دوستوں میں صرف شہباز زندہ رہ گیا ہے۔ اُس کی بینائی اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ دو قدم آگے کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر کبھی کبھی قبرستان میں لے جایا کرتا ہوں اور ہم اپنے دوستوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھا کرتے ہیں۔

"دیکھو لڑکی!" ــــ شہباز نے اُسے کہا ــــ "ہم مرد ہیں۔ ہماری غیرت برداشت نہیں کر سکتی کہ اکیلی لڑکی کو یہاں چھوڑ جائیں۔ اگر نہیں بتاؤ گی کہ تم کون ہو اور یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو تو ہم تمہیں اٹھا کر اپنے گاؤں لے جائیں گے اور تمہارے وارثوں کو ڈھونڈ کر تمہیں اُن کے حوالے کر دیں گے۔"

لڑکی کی حرکتوں اور باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ مظلوم ہے اور ظالموں کے ڈر سے بولتی نہیں۔ اگر وہ پاگل ہوتی تو پتہ چل جاتا۔ پاگل اس طرح باتیں نہیں کیا کرتے۔ وہ آخر دیہاتن تھی اور اکیلی۔ ہم چار تھے۔ ہم نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ سچی بات بتائے۔ اُس نے سب سے پہلے اپنے گاؤں کا نام اور اپنے باپ کا نام بتایا۔ ہم نے اُسے کہا کہ ہمارے ساتھ اُوپر چلے جہاں اُسے یہ شک نہ رہے کہ وہ ایک کھڈ میں چار آدمیوں کے ساتھ اکیلی ہے۔

وہ ہمارے ساتھ چل پڑی۔ اُوپر جا کر ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

ہم نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ چادر بچھائی اور اپنے اپنے پراٹھے اکٹھے رکھ دیئے۔ لڑکی اتنی بھوکی تھی کہ لپک کر ایک پراٹھا اٹھا لیا۔ ہم نے ابھی دو چار لقمے کھائے تھے کہ وہ پورا پراٹھا کھا گئی اور ایک اور اُٹھا لیا۔

"تم اگر مجھے میرے گاؤں لے گئے تو میرا چچا مجھے قتل کر دے گا" ــــ اُس نے کھانا کھا کر کہا ــــ "میں ایک آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"مجھے بے آبرو کر کے چلا گیا ہے" ــــ اُس نے جواب دیا اور اُس کے آنسو بہنے لگے ــــ "میں نے کل کی آدھی رات، سارا دن، ایک اور رات یہیں گزاری ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں، کہاں جاؤں۔"

"تمہاری شادی تو نہیں ہوئی نا!"

"سات آٹھ مہینے ہوئے شادی ہو گئی تھی" ــــ اُس نے کہا۔

"وہ مر گیا ہے یا خاوند کو چھوڑ کر بھاگی ہو؟"

اُس نے خاوند کو گالی دے کر کہا ــــ "زندہ ہے۔"

اُس کے ساتھ جو بیتی تھی وہ اُس نے سُنا دی۔ وہ معمولی سے ایک کسان کی بیٹی تھی۔ دس گیارہ سال کی تھی تو اُس کی ماں مر گئی۔ ڈیڑھ پونے دو سال بعد باپ بھی مر گیا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ اب لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ ان دونوں کو چچا نے اپنے گھر رکھ لیا اور ان سے نوکروں کی طرح کام لینے لگا۔ دیہات میں تو ہر کوئی نوکر ہی ہوتا ہے۔ محنت کر کے روزی ملتی ہے۔ ان کی ضرورت پیٹ تک محدود ہوتی ہے۔ چچا اور چچی کا سلوک بُرا نہیں تھا لیکن لڑکی جب جوان ہوئی تو چچا نے اس کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کر دی۔ بیٹا ضرورت سے زیادہ تندرست تھا۔ شکل صورت بھی اچھی لیکن دماغی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ لوگ اُسے جھلّا (پاگل) کہا کرتے تھے۔

کبھی کبھی صحیح باتیں کرتا تھا لیکن زیادہ تر پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ اُس کی زیادہ تر حرکتیں ایسی ہوتی تھیں جیسے وہ دو تین سال کا بچہ ہو۔ اُسے جو کوئی بھی بلاتا تو وہ اُسے حیران ہو کر دیکھتا اور سنجیدہ ہو جاتا پھر ہنسنے لگتا اور دوسری طرف

چل پڑتا تھا۔ یہ لڑکی اُس کے گھر میں رہتی تھی۔ اُس نے لڑکی کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ کھانے بیٹھتا تھا تو کھاتا ہی چلا جاتا تھا۔ پانی بھی مویشیوں کی طرح پیتا تھا۔

ایسے لڑکے کو کون اپنی بیٹی دیتا؟ چچا نے اپنے مرے ہوئے بھائی کی اتنی خوبصورت لڑکی گھر میں پال لی تھی۔ اُس نے اپنے جھلّے بیٹے کو اسی کے ساتھ بیاہ دیا۔ لڑکی نے ہمیں بتایا کہ پہلی رات اُس کے دولہا کو زبردستی اُس کے کمرے میں داخل کیا گیا۔ وہ پھر باہر نکل گیا۔ اُسے پھر کمرے میں لائے اور اُسے سمجھایا کہ وہ یہیں سوئے گا۔ اُس نے بچوں کی طرح منہ بسور کر کہا کہ وہ ماں کے پاس سوئے گا۔ اُس کی ماں نے لڑکی کے کان میں کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لگا لے اور اسے بتائے کہ وہ اس کی دُلہن ہے اور پھر وہ اس کی دلہن بن کر دکھائے۔

لڑکی چالاک نہیں تھی۔ چالاک اور ہوشیار ہوتی تو چچا کے قبضے میں نہ رہتی۔ اپنے باپ کی زمین اپنے قبضے میں لے لیتی اور بٹائی پر دے دیتی۔ وہ ہمارے ساتھ جس طرح باتیں کر رہی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے یہ بھی احساس نہیں کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔ وہ غریب تو تھی لیکن چوباروں اور مربعوں والے ہاتھ جوڑ کر اُس کا رشتہ لے لیتے۔

پہلی رات اُس نے اور اُس کے دولہا کی ماں نے بڑی ہی مشکل سے دُولہا کو اس کمرے میں بٹھایا۔ ماں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کچھ وقت گذرا تو دُولہا نے دروازے پر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔ وہ ماں کو آوازیں دیتا تھا۔ ماں نے دروازہ کھولا تو دولہا نے بچوں کی طرح کہا — "میں اس کے پاس نہیں بیٹھوں گا۔ یہ مجھے چھیڑتی ہے۔ گندی گندی باتیں کرتی ہے"۔

لڑکی نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں بتایا کہ یہ پہلا مرد ہے جس کے وہ اتنی قریب ہوئی تھی۔ گاؤں کے خوشحال زمینداروں کے بیٹے اُس پر جال پھینکتے رہے لیکن اُس نے کسی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ اُسے پیسے دکھائے گئے۔ سونے کی انگوٹھیاں دکھائی گئیں لیکن وہ سب کے لیے چلتی پھرتی لاش بنی رہی مگر اُسے جو خاوند ملا وہ اُس کے لیے چلتی پھرتی لاش تھا۔ پہلی رات دولہا میاں نے باقی رات ماں کے ساتھ گزاری اور دُلہن روتے روتے سو گئی۔ اس میں یہ احساس

بڑا مضبوط تھا کہ عورت صرف اپنے خاوند کی ہوتی ہے۔

پھر دن بھی گذرنے لگے اور راتیں بھی گذرنے لگیں۔ اُس کا خاوند سات آٹھ راتیں ماں کے کہنے پر اُس کے پاس کچھ دیر رہا پھر قہقہے لگاتا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس کے بعد اُس نے پوری رات لڑکی کے ساتھ گذاری مگر برف کے تودے کی طرح پڑا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ سمجھنے لگا لیکن لڑکی کی کوششوں کے باوجود وہ مُردہ اور برف کا بلاک ہی رہا۔ لڑکی کے وجود میں آگ سی سلگنے لگی اور اُسے غصّہ آنے لگا۔

تین چار مہینے گذرے تو سیدھی سادی لڑکی ایسی مجبور ہُوئی کہ پہلے کی طرح سیدھی سادی نہ رہی۔ چچا اور چچی جو شادی سے پہلے اس کے ساتھ رُعب سے بات کرتے تھے اب اس کے آگے جھکے جھکے رہنے لگے۔ اب لڑکی نے ان پر رعب جھاڑنا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں نے بھی ان کے خلاف باتیں شروع کر دی تھیں کہ انہوں نے اتنی خوبصورت لڑکی کو پاگل کے ساتھ بیاہ کر اس کی زندگی تباہ کر دی ہے۔

لڑکی بالکل ہی بدل گئی۔ چپ چاپ رہنے والی لڑکی اب عورتوں میں بیٹھ کر بڑی دلیری سے باتیں کرتی تھی۔ چھ سات مہینے گذر گئے۔ ان کی برادری کا ایک جوان آدمی تھا جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدمعاشی میں بھی منہ مارتا تھا۔ اُس نے اس لڑکی کے قریب ہونے کی کوشش کی تو لڑکی اُس کی طرف مائل ہو گئی۔ دونوں میں پیار و محبت کی باتیں بھی شروع ہو گئیں لیکن لڑکی نے اُسے کہا کہ میں بدکاری کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گی۔ اگر مجھے چاہتے ہو تو میرے خاوند کو زہر دو یا اسے کسی اور طریقے سے ختم کر دو اور میرے ساتھ شادی کر لو۔

اس آدمی نے یہ تجویز نہ مانی۔ لڑکی نے اُس کی بات نہ مانی۔ آخر اس آدمی نے اُسے کہا کہ وہ گاؤں کی زندگی سے ویسے ہی تنگ ہے۔ اگر لڑکی تیار ہو تو وہ اُسے گھر سے بھگا لے جائے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ لاہور فوج میں اُس کا ایک بڑا گہرا دوست ہے۔ اُس کے پاس چلے جائیں گے اور وہ اُسے وہاں نوکری دلا دے گا۔ اس طرح اُس نے لڑکی کو سبز باغ دکھائے اور اُسے گھر سے

بھاگنے پر راضی کر لیا۔ لڑکی اپنے پاگل خاوند سے اس قدر تنگ آچکی تھی کہ اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خاوند زندہ ہو تو طلاق کے بغیر وہ کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔

ایک رات وہ گھر سے نکلی۔ وہ آدمی اُس جگہ کھڑا تھا جہاں اُس نے کہا تھا۔ دونوں چل پڑے۔ گاؤں سے تقریباً تین میل دُور آکر اس جوان نے لڑکی کو بدی پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی۔ آدمی نے اُسے دبوچ کر گرا لیا۔ اُس نے لڑکی کو زبردستی بے آبرو کیا اور کہا کہ وہ واپس گاؤں جا رہا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ اُسے ساتھ لایا تھا۔ اگر اُس نے کسی سے شکایت کی تو وہ کہے گا کہ یہ کسی اور کے ساتھ گئی ہوگی۔ اس طرح دھمکیاں دے کر وہ واپس چلا گیا۔

لڑکی کو اتنا صدمہ ہُوا کہ اُس کی رہی سہی عقل بھی ماری گئی۔ اُسے یہ ڈر بھی محسوس ہُوا کہ واپس جاتے جاتے بہت سا وقت گزر جائے گا۔ ہو سکتا ہے گھر والوں کو پتہ چل چکا ہو کہ وہ گھر سے غائب ہے۔ وہ گھر گئی تو کیا جواب دے گی۔ صدمے اور پکڑے جانے کے ڈر سے وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اُسے یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ جو آدمی اُسے دھوکہ دے گیا تھا وہ اُسے اور زیادہ بدنام کرے گا۔ دراصل اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اُس نے رات وہیں گزار دی۔ دوسرا دن اور ایک رات اور یہیں گزر گئی۔ خوف اور بھوک نے اُسے آدھا مار ڈالا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اس اجاڑ بیابان میں اُسے ڈر نہیں لگا؟

"ڈرنے کی اور یہ سوچنے کی کہ میں کس طرح اپنے آپ کو ختم کر لوں، مجھے ہوش ہی نہیں تھی"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "ایسے لگتا تھا جیسے یہ خواب ہے۔ تم سب کو دیکھ کر میں ہوش میں آئی تھی۔"

اُسے خطرہ تھا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو وہ آدمی اُس کے ساتھ کر گیا تھا۔ یہ خطرہ ختم ہو گیا۔ وہ اپنے گاؤں کا نام بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔ کہتی تھی کہ چچا نے اُسے قتل نہ کیا تو بھی اُس کا جینا حرام کر دے گا۔ اسے پاگل خاوند کے ساتھ ساری زندگی گزارنی تھی۔ وہ خواہ کچھ ہی سوچتی ہم اُسے وہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہماری مردانگی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ایک مظلوم لڑکی کو مرنے

کے لیے یا بھیڑیوں کا شکار ہونے کے لیے یا کسی بدمعاش کے ہاتھ چڑھ جانے کے لیے اکیلی چھوڑ آتے۔

اُسے ہماری یہ بات سمجھ آ گئی کہ وہ ہمارے گاؤں چلی چلے۔ ہم اپنے بزرگوں کو ساری بات سنائیں گے اور وہ اسے اُس کے گاؤں لے جا کر اُس کے چچا کو سمجھا دیں گے اور اُس آدمی کو پکڑیں گے جس نے اُسے دھوکہ دیا ہے۔

وہ ہمارے ساتھ چل پڑی۔ چلتے چلتے رُک جاتی اور کہتی تھی کہ اپنے گاؤں میں نہیں جاؤں گی۔ ہم اُسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے آئے۔ میں نے اُسے والد صاحب کے حوالے کیا۔ میرے دوستوں کے بھی باپ آ گئے۔ عورتوں نے دیکھا کہ لڑکے ایک لڑکی کو لائے ہیں تو عورتیں ہمارے گھر میں اکٹھی ہو گئیں۔ ہم نے بزرگوں کو ساری بات سنائی۔ ایک دو نے شک کا اظہار کیا کہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ بات کچھ اور ہو گی لیکن اکثریت لڑکی کو مظلوم سمجھ رہی تھی۔ بعض کہتے تھے کہ لڑکی کو تھانے لے جایا جائے اور اس کے چچا کے خلاف یہ رپورٹ درج کرائی جائے کہ یہ یتیم لڑکی ہے اور چچا نے اسے اپنے پاگل بیٹے کے ساتھ بیاہ دیا ہے۔ دوسری رپورٹ اُس آدمی کے خلاف درج کرائی جائے جس نے اسے اغوا اور بے آبرو کیا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ رات کو نہ تھانے جایا جا سکتا تھا نہ لڑکی کے گاؤں کو۔ یہ معاملہ دوسرے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔ میری ماں نے لڑکی کو دودھ مکھن کھلایا اور بڑے پیار سے سُلایا۔ بزرگ اپنے اپنے طور پر رات کو سوچتے رہے۔ آج کے زمانے میں کون کسی کے ساتھ اتنی ہمدردی کرتا ہے۔ ایسی مظلوم لڑکی کو کوئی اور زیادہ خراب نہ کرے تو اُسے یوں اپنی پناہ میں بھی نہ لے جس طرح ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے اس لڑکی کو پناہ میں لے لیا تھا۔ یہاں تک ہی نہیں، وہ اس لڑکی کی پوری پوری مدد کرنے کی سوچ رہے تھے۔

یہاں میں ایک بات کہوں گا جو ممکن ہے کہ آپ مجھے جاہل اور پسماندہ کہیں گے۔ بات یہ ہے کہ علم اچھی چیز ہے لیکن علم نے انسان کو خراب بھی کیا ہے۔ اپنی غلطیوں اور گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے علمِ نفسیات اور فلسفہ موجود ہے۔

انسان جس بے دردی سے تجارت کے نام پر انسان کی کھال اتار رہا ہے اسے افراطِ زر کا نام دے کر جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ عوام کو محکوم بنا کر اور انہیں بھوکا ننگا رکھ کر یہ کہہ دینے کو کہ یہ عوام کی منتخب کی ہوئی حکومت ہے جمہوریت کہہ دیا گیا ہے۔ پاکستان کے نوجوان جس طرح جنسیت میں ڈوب گئے ہیں اسے "عالمی مسئلہ" کہہ کر برداشت کر لیا گیا ہے۔ باہمی پیار، محبت اور دُکھ بانٹنے کو ترک کر کے ہم "اُیڈوانس" ہو گئے ہیں۔ ہنس کے پَر لگا کر ہم ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

ہمارے بزرگ اَن پڑھ تھے، اس لیے اُن میں انسان کی محبت اور خلوص تھا۔ دوسرے دن وہ پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ لڑکی محفوظ رہے اور اسے گھر سے بھاگنے کی کوئی سزا نہ دے۔ انہیں بتایا گیا کہ لڑکی کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر نہیں جائے گی۔ یہیں کسی گھر میں نوکری کرتی رہے گی۔ بزرگوں نے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی رو رہی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ مر جائے گی اپنے گھر نہیں جائے گی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ پولیس آ رہی ہے۔ نمبردار دوڑا گیا۔ میرے بھائی احمد یار خان نے آپ کو کئی بار بتایا ہے کہ نمبردار اور پولیس کا آپس کا کیا تعلق ہُوا کرتا تھا۔ کوئی نمبردار نماز پڑھ رہا ہوتا اور اُس کے کانوں میں پڑتی کہ تھانیدار آیا ہے تو وہ سلام پھیر کر تھانیدار کے حضور جا جھکتا تھا۔

پولیس کی اطلاع ملنے پر ہم سب اُدھر گئے جدھر سے پولیس آ رہی تھی۔ ایک تھانیدار تھا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل پیدل تھے۔ نمبردار نے اور ہمارے بزرگوں نے تھانیدار کو خاطر تواضع کے لیے روک لیا۔ تھانیدار کے ساتھ دو اور آدمی تھے۔ ایک کسی گاؤں کا نمبردار تھا۔ تھانیدار نے بتایا کہ فلاں گاؤں میں قتل کی واردات ہو گئی ہے۔ اُس نے جس گاؤں کا نام لیا وہ اس لڑکی کا گاؤں تھا۔

وہاں کے نمبردار نے یہ واردات اس طرح سنائی کہ ایک آدمی نے اپنی یتیم بھتیجی اور یتیم بھتیجے کو اپنے گھر رکھا اور جب لڑکی جوان ہو گئی تو اُس نے اپنے اُس بیٹے کے ساتھ اُس کی شادی کر دی جو دماغی لحاظ سے معذور ہے اور سب

اُسے جھلّا کہتے ہیں۔ وہ ہے ہی پاگل۔ لڑکی بڑی شریف اور چُپ چاپ رہنے والی تھی۔ آخر بے چاری مجبور ہو گئی اور ایک رات گھر سے بھاگ گئی۔ اُسے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے۔ اُس کے چچا کو سب نے کہا کہ تھانے رپورٹ لکھا دو لیکن اُس نے پرواہ نہ کی۔ لڑکی کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ اُس کی عمر پندرہ سولہ سال ہے۔ وہ سخت غصّے کی حالت میں گاؤں میں پھرتا اور ہر کسی سے کہتا رہا کہ اُس کے چچا سے کہیں کہ میرے ساتھ تھانے چلے۔

"آج صبح جب ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا لڑکی کا بھائی میرے گھر آیا" — نمبردار نے کہا — "اُس کے پاس کلہاڑی تھی جس پر خون ہی خون تھا۔ اُس نے کہا کہ میں اشرو کو قتل کر آیا ہوں۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اُس نے اُس کی بہن کو اشرو (پورا نام اشرف) کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ پھر ایک آدمی سے اُسے یہ پتہ چلا کہ سحری کے وقت اشرو کہیں سے اکیلا آ رہا تھا۔ لڑکے کو اس لیے بھی یقین ہو گیا کہ اُس کی بہن کو اشرو نے غائب کیا ہے کہ اُس نے اشرو اور اپنی بہن کو کئی بار باتیں کرتے دیکھا تھا....

"لڑکے نے مجھے بتایا کہ صبح سویرے وہ کلہاڑی لے کر اشرو کے گھر گیا۔ اشرو کھیتوں میں چلا گیا تھا۔ لڑکے نے اُس سے اپنی بہن کے متعلق پوچھا۔ اشرو نے اُسے اتنی گندی بات کہہ دی جو لڑکا برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے پہلی کلہاڑی اُس کی گردن پر اس طرح ماری کہ آدھی گردن کٹ گئی۔ اشرو گرا تو لڑکے نے دوسری کلہاڑی اتنی زور سے گردن پر ہی ماری کہ گردن کٹ کر جسم سے الگ ہو گئی اور لڑکا میرے پاس آ گیا۔ میں تھانے چلا گیا۔ لڑکے کو میں اپنی ایک کوٹھڑی میں بند کر آیا ہوں"۔

ہم نے انہیں بتایا کہ وہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور ہم اُسے فلاں جگہ سے لائے ہیں۔ تھانیدار کو ہم نے ساری بات سنا دی۔ تھانیدار نے کہا کہ لڑکی کو لے آؤ۔ میں اپنے گھر جا کر لڑکی کو لے آیا۔ میں نے اُسے نہ بتایا کہ اُس کے بھائی نے اُس آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ لڑکی نے مجھے دو مرتبہ کہا — "میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی"۔

پولیس کو دیکھ کر وہ گھبرائی لیکن اُسے جونہی پتہ چلا کہ اُس کے بھائی نے اشرو کو قتل

کر دیا ہے تو وہ جیسے پھٹ پڑی ہو "میرے بھائی کو تم پھانسی نہیں دے سکتے۔ اُس نے غیرت سے اُس مردود کو قتل کیا ہے۔ چلو، میرے گاؤں چلو۔ میں سارے گاؤں کو اپنا بیان سناؤں گی۔ تم تھانیدار ہو تو میرے ساتھ انصاف کرو۔ سُن تھانیدار جی! تیری بیٹی کو ایک پاگل کے ساتھ بیاہ دیں تو بتا تو کیا کرے گا؟" ——لڑکی کے ہونٹوں سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ اُس نے اپنے گاؤں کے نمبردار کو بھی کھری کھری سنا ڈالیں لیکن تھانیدار اُس کی حمایت میں بول رہا تھا۔

تھانیدار نے لڑکی کو ٹھنڈا کیا اور اُسے تسلی دی کہ اُس کے بھائی کو وہ زیادہ سزا نہیں ہونے دے گا، اور اُسے کہا کہ وہ یہیں بتا دے کہ اُس پر کیا بیتی ہے۔ اُس نے وہی آپ بیتی سنا دی جو ہمیں سنائی تھی۔ نمبردار ساتھ ساتھ اضافے کرتا گیا۔ تھانیدار خوشاب کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ نام شاید کمال دین یا جمال دین تھا۔ بڑے اُونچے خاندان کا آدمی تھا۔ گالیاں بڑی ننگی بکتا تھا۔ لڑکی بیان دے رہی تھی۔ وہ اپنے چچا کا، اپنے خاوند کا یا اشرو کا نام لیتی تھی تو تھانیدار کے منہ سے دو تین بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز گالیاں نکل جاتی تھیں۔ لڑکی نے جب بیان ختم کیا تو تھانیدار نے آدھی درجن گالیاں دے کر کہا "میں اس کے چچا کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

اُس نے اپنا یہ وعدہ پورا کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ تھانیدار لڑکی کے گاؤں چلا گیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے واپس آیا اور ہمارے گاؤں کے قریب سے گذرا۔

ہم نے لڑکی کے بھائی کو ہتھکڑیوں میں دیکھا۔ بڑا خوبصورت لڑکا تھا۔ لڑکی بھی ساتھ تھی۔ اُس کا چچا بھی ساتھ تھا۔ گاؤں کے کئی اور آدمی ساتھ تھے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پہلے جا چکی تھی۔ تھانیدار نے مجھے اور میرے اُن تین دوستوں کو بھی ساتھ لے لیا جو لڑکی کو ساتھ لائے تھے۔

دوسرے دن تھانیدار ہمیں اور لڑکی کو اُس جگہ لے گیا جہاں ہمیں لڑکی ملی تھی۔ لڑکی نے وہ جگہ دکھائی جہاں مقتول نے لڑکی کو پکڑا اور گرایا تھا۔ کھوجی ساتھ تھا۔ تھانیدار مقتول کی جُوتی ساتھ لایا تھا۔ کُھرے صاف تھے جو مقتول کی جُوتی کے تھے۔

اس کے بعد کیس عدالت میں گیا پھر سیشن کورٹ میں گیا۔ میں اور میرے دوست گواہی دینے جاتے رہے۔ ہم نے لڑکی کا بیان بھی سُنا۔ سیشن جج ہندو تھا۔ سرکاری وکیل بھی لڑکی کے بھائی سے متاثر ہو گیا تھا۔ لڑکے نے اقبالِ جرم کر لیا تھا کہ اُس نے اشرو کو قتل کیا ہے۔ آخر سیشن جج نے فیصلہ سنایا۔ لڑکے کو اُس نے صرف تین سال سزائے قید دی۔ اُس نے فیصلے میں لکھا کہ لڑکے کو ایسا اشتعال دیا گیا جسے اس عمر کا لڑکا برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا لڑکے کا اتنا شدید ردِ عمل اشتعال کا نتیجہ ہے۔ اس صورت میں لڑکے کو زیادہ سزا نہیں دی جا سکتی۔

تھانیدار نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا تھا۔ اس کے بعد تھانیدار نے لڑکی کے چچا کو گرفتار کر لیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے یہ کیس کس دفعہ کے تحت تیار کیا تھا۔ مجھے تفصیلات کا علم نہیں۔ مجھے یہی پتہ چلا تھا کہ لڑکی کے چچا کو ایک سال سزائے قید دی گئی تھی۔

وقت گزرا اور گزرتا چلا گیا۔ یہ واقعہ ذہن کے کسی گوشے میں چلا گیا۔ ایک روز لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ ہمارے گاؤں میں آئی۔ اس کا بھائی سزا کاٹ کر آ گیا تھا۔ وہ اب اٹھارہ انیس سال کا جوان تھا۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی کو پاگل خاوند سے طلاق مل گئی تھی اور بھائی نے اپنے باپ کی زمین سنبھال لی تھی۔ بہن کو وہ اپنے ماں باپ کے مکان میں لے گیا تھا۔

چوروں کی یاری

اب گاؤں میں جاتا ہوں تو دل کو تکلیف سی ہوتی ہے۔ نہ جاؤں تو بے چینی محسوس ہوتی ہے۔ میری جڑیں گاؤں میں ہیں۔ ہم نے بڑا اچھا وقت دیکھا ہے۔ آج کل اچھے اور بُرے وقت کا تصوّر بدل گیا ہے۔ "اچھے وقت" سے لوگ یہ مطلب لیتے ہیں کہ روپے پیسے کی فراوانی اور ہر طرح کی آزادی ہو گی۔ "بُرے وقت" کو وہ مصیبت کا وقت کہتے ہیں، لیکن ہم پُرانے لوگ اُس گذرے ہوئے زمانے کو اچھا وقت کہتے ہیں جب خلوص، پیار، ہمدردی اور ملنساری تھی۔ انسانوں میں بناوٹ نہیں تھی۔ ہر کوئی اپنے قدرتی رنگ اور انداز میں نظر آتا تھا۔ بہروپ کا رواج نہیں تھا۔

اب بناوٹ ہی بناوٹ ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے ہوں اور ہر کوئی اپنے فائدے کے لیے چکر باز ہو گیا ہو۔ اب تو زمین بھی مصنوعی ہو گئی ہے۔ مصنوعی کھاد فصل کو اُونچا ہوتے ہی نہیں دیتی۔ فصل کی طرح مردوں اور عورتوں کے قد بھی چھوٹے چھوٹے رہ گئے ہیں۔ سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔ وہاں کے ٹیلے اور گھاٹیاں بہہ گئی ہیں جہاں ہم کُتّوں سے شکار کھیلا کرتے تھے۔ سڑکیں بن گئی ہیں۔ اب وہاں سکوٹر اور موٹر سائیکل چلتے ہیں۔ باہر کے پیسے کی کاریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ سوزوکی گاڑیاں، ویگنیں اور بسیں چلتی ہیں۔ لوگ پیدل چلنا بھول گئے ہیں۔

ہمارے وقتوں میں ندی نالوں کی رونق الگ تھی۔ انہیں ہم کَس اور کَسیاں کہا کرتے تھے۔ ساون میں ان میں سیلاب آجاتا تھا۔ اب چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا کر

یہ رونق ختم کر دی گئی ہے۔ میرے علاقے کا حُسن تباہ کر دیا گیا ہے۔

یہ کہانی سنانے سے پہلے ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ کہتے ہوں گے کہ اس بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اسے اتنے پسماندہ علاقے کی ترقی اچھی نہیں لگتی اور آج کے زمانے کو سو سال پیچھے لے جانا چاہتا ہے۔ اگر آپ نے ایسا سوچا ہے تو غلط سوچا ہے۔ میں ترقی کے خلاف نہیں، مجھے افسوس یہ ہے کہ جس طرح پگڈنڈیاں پکّی سڑکیں بن کر اپنا قدرتی رُوپ کھو بیٹھی ہیں اسی طرح انسان بھی مصنوعی ہو گئے ہیں۔ لپ سٹک نے مسکراہٹوں کو بناوٹی بنا دیا ہے۔

دیہاتی علاقے میں بھی اب نئی طرز کی کوٹھیاں نظر آنے لگی ہیں۔ پکّے مکان اور چوبارے زیادہ ہو گئے ہیں لیکن ایسے لگتا ہے جیسے گاؤں اُجڑ گئے ہوں۔ گہما گہمی رہی ہی نہیں۔ لوگ دوسرے ملکوں میں پیسہ کمانے چلے گئے ہیں۔ روپیہ پیسہ سمیٹنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

میں کہہ رہا تھا کہ گاؤں میں نہ جاؤں تو بے چینی ہوتی ہے، جاؤں تو دل بیزار ہوتا ہے۔ اس سال اپریل کے آخری دنوں کی بات ہے، مجھے اپنے فصل کی کٹائی دیکھنے گاؤں جانا پڑا۔ میں گھوڑی پر بیٹھا اور لڑکپن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے اُن ویرانوں کا رُخ کر لیا جہاں ہم اپنے کتّوں کے ساتھ بے گناہ خرگوشوں اور گیدڑوں کے پیچھے دوڑا کرتے تھے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے ہم بھاگتے دوڑتے بڑھاپے میں جا پہنچے ہیں۔

میں اپنے گاؤں سے دو اڑھائی میل دُور نکل گیا اور ایک پگڈنڈی پر جا پہنچا۔ میری جوانی کی یہ پگڈنڈی اب پکّی سڑک بن چکی ہے۔ بڑی اچھی اچھی کہانیاں، بڑی بُری بُری وارداتیں اور اچھے بُرے قصّے اس سڑک کے نیچے دفن ہو گئے ہیں لیکن مجھ سے ان کی یادیں کوئی نہیں چھین سکتا۔ پتھروں اور تارکول کے نیچے دبی ہوئی اس پگڈنڈی پر پہنچتے ہی مجھے یادیں لڑکپن میں لے گئیں اور میرے اردگرد کُتّے بھونکنے لگے مگر دو موٹر سائیکل جو معلوم نہیں ہونڈے تھے یا یاماہا، میرے قریب سے گذر کر مجھے لڑکپن سے اُٹھا کے بڑھاپے میں پھینک

گئے اور میں کچّی پگڈنڈی سے ہٹ کر پکّی سڑک پر کھڑا ہو گیا۔

ان جاپانی موٹر سائیکلوں پر دو لڑکے سوار تھے۔ ایسے لڑکوں کو آج کل نوجوان کہا جاتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں چودہ پندرہ سال سے اُوپر کے لڑکوں کو جوان کہا جاتا تھا۔ آج کل کے لڑکوں کو شاید اس لیے نوجوان کہا جاتا ہے کہ جوان ہونا تو ان کی قسمت میں ہوتا ہی نہیں، وہ نوجوانی سے نکلتے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کے قد بُت رہے ہیں نہ فلمی گانوں اور ایکٹرسوں کی تصویروں نے اِن کے جسموں میں کچھ رہنے دیا ہے۔ چند دن نوجوانی میں گذار کر بڑھاپے میں جا گرتے ہیں۔

اِن دونوں موٹر سائیکلوں کے نوجوان سوار اسی نسل کے معلوم ہوتے تھے۔ دیہاتی علاقے میں یہ نسل نئی تہذیب کے ساتھ آئی ہے۔ میرا بچپن کا یار، راجہ شہباز خان کہا کرتا ہے کہ اس سائز کے نوجوان ہمیں امریکی امداد کے ساتھ ملے ہیں۔ وہ دونوں موٹر سائیکل لہراتے ہوئے جا رہے تھے جسے زِگ زیگ چلانا کہتے ہیں۔ وہ جب میرے قریب سے گذرے تھے تو میری گھوڑی ذرا بدک گئی تھی۔ ان نوجوانوں نے موٹر سائیکل گھمائے اور واپس آ گئے۔ ایک میری گھوڑی کے بہت قریب سے گذرا۔ گھوڑی پھر ذرا سی بدکی۔

وہ پھر واپس آئے اور اب کے آگے پیچھے ہو کر انہوں نے موٹر سائیکل میری گھوڑی کے اور زیادہ قریب سے گذارے۔ جب ہم ان کی عمر میں تھے تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ بزرگوں کے ساتھ چھیڑ خانی کریں، لیکن امریکی امداد کے ساتھ آئی ہوئی اس نسل کے نوجوان اپنے دادا کی عمر کے آدمی کو چھیڑ کر لطف اُٹھا رہے تھے۔ کچھ دُور آگے دو عورتیں سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھیں۔ موٹر سائیکلوں کے شہسواروں نے اُن کے قریب سے بھی موٹر سائیکل گذارے۔ وہ دونوں عورتیں میری گھوڑی کی نسبت زیادہ بدکیں۔ لڑکے موٹر سائیکل زِگ زیگ چلاتے چلے گئے۔ وہ تفریح کے مُوڈ میں تھے۔

مجھے غصّہ آ گیا۔ سڑک خالی تھی۔ دیہات کی سڑکوں پر ٹریفک نہیں ہُوا کرتی۔ میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ گھوڑی دوڑ پڑی۔ موٹر سائیکلوں کی رفتار بمشکل بیس

میل ہوگی۔ میں نے ایڑ لگا کر گھوڑی کی رفتار اور تیز کر دی اور موٹر سائیکلوں تک پہنچ گیا۔ وہ دونوں پہلو بہ پہلو جا رہے تھے۔ میں نے گھوڑی کو دائیں طرف والے موٹر سائیکل کے ساتھ لگا کر اُسے بائیں طرف بالکل اُسی طرح کرنا شروع کر دیا جس طرح ڈرائیور اپنی گاڑی سے کسی دوسری گاڑی کو سائیڈ مارا کرتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا ہوگا۔

ایسا ہونا ہی تھا۔ دونوں موٹر سائیکل بائیں کو ہٹتے گئے۔ سڑک کا کنارا ذرا اُونچا اور کچی زمین ذرا گہری تھی۔ پہلے بائیں طرف والا موٹر سائیکل کچے میں اُتر کر گرا، پھر دوسرا ذرا آگے جا کے کچے میں گھوما یا شاید بے قابو ہو کر گرا۔ میں نے گھوڑی کو پیچھے کو موڑا اور ان نوجوان سواروں کے گرد چکر لگایا۔ وہ گرد میں سے اُٹھ کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے بال بڑھائے ہوئے تھے۔ دونوں دُبلے پتلے اور آج کل کے قد بُت کے تھے۔ اُن کی ٹُش شرٹیں رضائیوں کے کپڑوں جیسی پھولدار تھیں اور پتلونیں دھاری دار کپڑے کی۔

میں گھوڑی سے اُترا۔ سڑک پر سواریوں والی ایک سوزوکی رُک گئی۔ ایک طرف سے چار پانچ کسان دوڑے آئے۔ سوزوکی میں دو حضرات جا رہے تھے جو مجھے جانتے تھے۔ وہ معززین میں شمار ہوتے تھے۔ میری طرح معمّر تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر سوزوکی رُکوائی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ یہ دونوں لڑکے مجھے بُرا بھلا کہیں گے لیکن اُن کے رنگ پیلے پڑ گئے تھے۔ اُن کے قدرتی رنگ تھے ہی پیلے۔ چہروں پر خون کے آثار بہت کم تھے۔ وہ سہمے ہوئے کھڑے رہے۔ بڑھاپے نے میرے جسم میں جتنی طاقت چھوڑی ہے وہ ساری صرف کر کے ایک تھپڑ ایک لڑکے کے منہ پر اور دوسرا دوسرے کے منہ پر مارا۔ ایک دائیں کو گرا دوسرا بائیں کو۔ میں نے دونوں کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"تم اس مٹی کی پیداوار نہیں ہو" — میں نے زمین پر پاؤں مار کر کہا — "تم پوٹھوہار کی مٹی کے گندے کیڑے ہو"۔

جو حضرات سوزوکی سے اُترے تھے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا ہُوا ہے۔ میں نے اُنہیں بتایا۔ دونوں بزرگوں نے لڑکوں کو قہر کی نظروں سے

دیکھا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ فلاں گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے مجھے ان کے دادا کا نام بتایا۔ یہ دونوں چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے باپ اور ایک بڑا بھائی باہر ملازم تھے۔ کویت یا ابوظہبی بتایا گیا۔ یہ خاندان بہت اُونچی ذات کا تو نہیں لیکن چھوٹی ذات کا بھی نہیں۔

"یہ دوبئی کے پیسے کا نشہ ہے" — ایک بزرگ نے کہا — "خدا نے چھپّر پھاڑ کر دیا ہے اور چھپّر کی طرح یہ بھی پھٹ گئے ہیں"۔

دونوں معززین سوزوکی میں بیٹھے اور سوزوکی چلی گئی۔ ان نوجوانوں کا گاؤں وہاں سے ڈیڑھ میل دُور تھا۔ مجھے ان کے دادا کا جو نام بتایا گیا تھا، اس نام سے میں واقف تھا۔ کہانیاں جو سچی ہوتی ہیں ان میں اصلی نام نہ لکھے جائیں تو اچھا ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کی توہین ہوتی ہے۔ میں جس دادا کا ذکر کر رہا ہوں اُس کا صحیح نام نہیں لکھوں گا۔

موٹر سائیکل سوار نوجوانوں کو وہیں چھوڑ کر میں اُن کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میں ان کے دادا کو بتانے جا رہا تھا کہ اُس کی آئندہ نسل کدھر جا رہی ہے۔

اس گاؤں سے میں واقف تھا لیکن وہاں گئے ایک عمر گزر گئی تھی۔ اب یہ گاؤں پہچانا نہ گیا۔ "دُوبئی" کے پیسے کے کرشمے صاف نظر آ رہے تھے۔ کچے مکان بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ کچھ مکان نئی طرز کے تھے۔ زیادہ تر دو منزلہ تھے جنہیں ہمارے وقتوں میں چوبارے کہا جاتا تھا۔ ان چوباروں کے سائے میں ایک کچّا مکان ہے جسے میں پہچانتا تھا۔ میں نے ان نوجوانوں کے دادا کے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ اُس بے چارے کو کہاں جانا ہے۔ چارپائی سے اُٹھ نہیں سکتا۔ اب تو موت کے انتظار میں ہے۔

میں نے گھوڑی باہر ایک درخت کے ساتھ باندھی اور اندر چلا گیا۔ وسیع صحن میں ایک درخت بیری کا اور ایک شہتوت کا تھا۔ بیری کے درخت کے نیچے چارپائی بچھی تھی جس پر ایک ضعیف آدمی لیٹا ہُوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی ہی مشکل سے اُٹھا اور بیٹھ گیا۔ میں اُس کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں کے دائیں بائیں رکھے اور آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

"پہچانا نہیں مجھے؟" ــــ میں نے کہا۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے، تم صابر ہو" ــــ اس نے نحیف آواز میں کہا ــــ "اوئے صابو! تو آج صدیوں بعد کدھر آنکلا؟"

اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر چوما۔ میں نے اُس کی طرف سرک کر اُسے گلے لگا لیا۔ اُس نے میرے گلے میں ایسے بازو ڈالے کہ الگ ہی نہیں ہوتا تھا۔ ذرا دیر بعد اُس کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ رو رہا تھا ــــ اور میرا ذہن بہت دُور پیچھے چلا گیا۔ ہم نے نوجوانی میں بڑا اچھا وقت گذارا تھا۔ اکھٹے شکار کھیلا تھا۔ آج اُس کے پاس بیٹھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔

ہم نوجوان تھے۔ ہمارے کُتے دُور دُور تک مشہور ہو گئے تھے۔ ایک روز ہماری عمر کا ایک نوجوان دیہاتی جو کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا، ہمارے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ اُسے رکھوالی کے لیے ایک کُتا چاہیئے۔ رکھوالی کے کُتے کا استعمال یہ ہوتا ہے کہ رات کو اسے کھُلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی مشکوک آدمی گھر کے قریب آئے تو بھونک کر اُس پر حملہ کر دیتا ہے۔ ایک تو وہ خود حملہ کرتا ہے، دوسرے اُس کے بھونکنے پر گھر والے جاگ اُٹھتے اور باہر آکر دیکھتے ہیں کہ کُتا کیوں بھونک رہا ہے۔ رکھوالی کے کُتے کی موجودگی میں گھر میں چوری ڈکیتی نہیں ہو سکتی۔ ایسے کُتوں میں یہ وصف ہوتا ہے کہ گاؤں کا کوئی بھی آدمی گھر کے قریب سے گزرے، یہ کُتا اُس پر نہیں بھونکتا۔

اِس نوجوان نے اپنا نام نواب دین بتایا تھا۔ ہم نے اُسے کہا کہ کسی کو دینے کے لیے ہمارے پاس کُتا نہیں۔ ایک کُتیا بچّے دینے والی تھی۔ ہم ان میں سے ایک بچّہ اُسے دے سکتے تھے لیکن اُسے بچہ نہیں بڑا کُتا درکار تھا۔ نواب خوش طبع نوجوان تھا۔ اُس کا گاؤں ہمارے گاؤں سے ساڑھے تین چار میل دُور تھا۔ ہمیں نواب اتنا اچھا لگا کہ سارا دن ہمارے پاس رہا اور شام کو گیا۔

اُس کا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کے گاؤں سے میل ڈیڑھ میل دُور چھوٹے سے ایک گاؤں میں جسے ڈھوک کہا جاتا تھا، اُس کی برادری کے دو تین گھر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ نواب دین کے خاندان کی بڑی پرانی دشمنی تھی جو نواب دین کی

پیدائش سے پہلے کی تھی۔ دونوں طرف سے دو دو تین تین آدمی قتل ہو چکے تھے اور دونوں طرف سے ایک ایک آدمی پھانسی چڑھ چکا تھا۔ بعض قید کی سزا کاٹ آئے تھے، مگر ان کے لڑائی جھگڑے جاری تھے۔ ہمارے علاقے میں ایسی دشمنیاں بڑی عام تھیں۔ پھانسی کا تختہ اور کالا پانی اِن دشمنیوں کو ختم نہیں کر سکے تھے۔

نواب دین کو رکھوالی کے کُتے کی ضرورت اس لیے آپڑی تھی کہ اُس کے دشمن خاندان میں ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو ہم پولیس حوالدار کہا کرتے تھے۔ اُس وقت یہ پولیس حوالدار ضلع جہلم کے ایک تھانے میں تھا۔ اس تھانے کا علاقہ ہمارے علاقے کے ساتھ لگتا تھا۔ یہاں سے ہمارا ضلع راولپنڈی شروع ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں پولیس حوالدار کا رُعب تھانیدار جتنا ہوتا تھا۔ نواب دین کے دشمن پولیس حوالدار نے نواب دین کے گھر ڈاکہ ڈلوانے کا انتظام کیا تھا۔ کسی ہمدرد نے نواب دین کے خاندان کو قبل از وقت بتا دیا تھا لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ ڈاکے کی واردات کب ہو گی۔

انتظام یوں کیا گیا تھا کہ ہمارے علاقے میں علیا نام کا ایک خوبصورت جوان آدمی تھا۔ وہ نامی گرامی ڈاکو نہیں تھا۔ جرائم پیشہ تھا۔ اُسے لوگ علیا کسبی کہتے تھے۔ کسبی کے معنی ہیں جرائم پیشہ یعنی وہ بُرے کسب کرتا تھا۔ پولیس حوالدار نے اُس کے ساتھ دوستی لگائی تھی اور اُسے کہا تھا کہ وہ نواب دین کے گھر ڈاکہ ڈالے۔ علیا نقب بھی لگا لیتا تھا۔ نواب دین کی ایک بہن جوان تھی۔ اُس کے لیے زیورات اور کپڑے بنوائے گئے تھے۔ شادی کے لیے گھر میں رقم بھی تھی۔ نواب دین کے دشمن چاہتے تھے کہ یہ مال لُٹوا دیا جائے۔ یہ مال انہیں اپنے گھر نہیں رکھنا تھا۔ وہ نواب دین کے خاندان کی کمر توڑنا چاہتے تھے۔

میں نے علیا کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کی شکل و صورت بہت اچھی اور قد بُت اور زیادہ اچھا تھا۔ خوش طبع اتنا کہ جس محفل میں بیٹھتا وہاں اپنے دشمنوں کو بھی ہنسا کر انہیں دوست بنا لیتا تھا۔ کپڑے صاف ستھرے پہنا کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ جرائم پیشہ ہے، سب اُس کی عزت کرتے تھے۔ وہ وارداتیں اپنے گاؤں سے بہت دُور جا کے کیا کرتا تھا۔

نواب دین کے مطلب کا کُتا ہمارے پاس نہیں تھا۔ وہ مایوس تو ہُوا لیکن ہمارا دوست بن کر رخصت ہُوا۔ سات آٹھ دنوں بعد وہ پھر آیا۔ اُس کے ساتھ بڑی ہی اچھی نسل کا ایک کُتا تھا۔ یہ بُل ٹیریئر اور ایلسیشیئن کی ملی جلی (کراس) نسل تھی۔ نواب دین کا چچا زاد بھائی یہ کُتا کہیں سے لایا تھا۔ نواب دین نے بتایا کہ یہ کُتا رکھوالی کا تربیت یافتہ ہے۔ بہرحال اس کُتے نے نواب دین کے ساتھ ہماری دوستی پکی کر دی۔ نواب دین کہتا تھا کہ ہم شکار پر جائیں تو اُسے بھی ساتھ لیتے جائیں

وہ دو مہینوں میں دو مرتبہ ہمارے ساتھ شکار پر گیا۔ پہلی بار جب اُس کا کُتا شکار پر جاتے ہوئے ہمارے کُتوں میں آیا تو ہمارے تمام کُتوں نے اُسے غور سے دیکھا اور سونگھا کہ یہ مذکّر ہے یا مؤنث۔ ہمارے کُتوں کا چال چلن کوئی ایسا بُرا نہیں تھا لیکن ہم اُن کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ البتہ ہمارے یار افضل کے بُوبلی کا مسئلہ کچھ اور تھا۔ وہ اپنی ٹیم کا لیڈر تھا۔ جب کوئی نیا کُتا ٹیم میں شامل ہوتا تھا، ہمارا بُوبلی اُسے یہ بتانا ضروری سمجھتا تھا کہ یہاں لیڈر کون ہے۔ اُس کا بتانے کا طریقہ اپنا ہی ہوتا تھا۔ اُس نے وہی طریقہ استعمال کیا۔ نواب دین کے کُتے کو دو تین پٹخنیاں دیں پھر اُس کی گردن کو منہ میں لے کر جھنجھوڑا۔ نواب دین کا کُتا سمجھ گیا۔ دوسری مرتبہ شکار پر گئے تو نواب دین اپنے گاؤں کے قریب ہم سے آملا۔ ہمارے بُوبلی نے یہ دیکھنے کے لیے کہ نواب دین کا کُتا پچھلا سبق بھول تو نہیں گیا، اُس کی طرف غرّا کر دیکھا۔ نواب دین کا کُتا نواب دین کی ٹانگوں کے درمیان چلا گیا۔ اُس نے بُوبلی کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

ان دو مہینوں میں نواب دین ہمیں اپنی دشمنی کے قصّے سناتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ ایک رات کُتا جسے رکھوالی کے لیے رات کُھلا چھوڑ دیا جاتا تھا، بڑی زور سے بھونکا۔ گھر کے آدمیوں کی آنکھ کُھل گئی۔ کُتا گاؤں سے باہر چلا گیا تھا اور واپس آ رہا تھا۔ گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ کوئی آدمی آیا تھا۔ وہ علیا ہی ہو سکتا تھا۔ سات آٹھ روز بعد پھر ایسے ہی ہُوا۔ اب کے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ وہ کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے اپنے مکان کے پچھواڑے سے دو تین آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں سنی تھیں۔ نواب دین کے گھر والوں نے دیکھا کہ کُتا جو

بھونکا بھی تھا، کسی کے پیچھے دوڑا بھی تھا، اب بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ یہ گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہ کہاں سے آیا تھا؟ ــــ یہ یقیناً وہ آدمی لائے تھے جو بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے یہ ٹکڑا کُتے کے آگے اس لیے پھینکا تھا کہ کُتا اسے کھانے لگے اور وہ واردات کر جائیں مگر کُتے نے گوشت کھانے سے پہلے اُن آدمیوں کو بھگانا ضروری سمجھا۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ کُتا بہت ہی اچھی نسل کا اور تجربہ کار ہے اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ پولیس حوالدار نے نواب دین کے گھر ڈکیتی کا جو انتظام کیا تھا اُس کی کوشش ہو رہی ہے۔

نواب دین نے یہ بھی بتایا کہ اُسے پتہ چلا ہے کہ پولیس حوالدار اور علیا کی دوستی اتنی گہری ہو گئی ہے کہ علیا اُس کے ساتھ گھر جاتا ہے۔ پولیس حوالدار خود تو اپنے تھانے میں ڈیوٹی پر رہتا تھا، اُس کے گھر والے علیا کی بہت خاطر تواضع کرتے تھے۔

" پولیس حوالدار کی ایک بہن جوان ہے"ــــ نواب دین نے ایک بار کہا ــــ "اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اگر میرے گھر میں ڈکیتی ہو گئی تو تم دیکھنا، میں حوالدار کی اِس بہن کو اُٹھا لاؤں گا۔ دن کو اٹھاؤں، رات کو اٹھاؤں، اُٹھاؤں گا ضرور، پھر چاہے میری جان چلی جائے۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے"۔

وہ کوئی عجیب بات نہیں کہہ رہا تھا۔ دشمنیوں میں کبھی کبھی کسی فریق کی کوئی جوان عورت اغوا کر لی جاتی تھی۔ اس پر خون خرابہ ہوتا تھا۔ کٹائی کے بعد جب فصل کھلیان میں رکھی جاتی تو دشمن اسے آگ لگا دیتے تھے۔

تیسری بار ہم نے ایسے موسم میں شکار کا پروگرام بنا لیا جو شکار کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ یہ ساون کا مہینہ تھا۔ ہمارے علاقے میں ساون خوب برستا تھا۔ ندی نالے جنہیں ہم کس اور کسیاں کہتے ہیں، بہتے رہتے تھے۔ بارش ہوتی تو ان میں سیلاب آ جاتا تھا۔ ساون میں ہر سُو ہریالی ہو جاتی تھی۔ ہم ایسے ہی موسم میں شکار کو چل پڑے۔ نواب دین بھی ساتھ تھا۔

دھوپ گرم تھی لیکن ہوا تیز اور ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر سفید اور مٹیلے بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے اُڑے جا رہے تھے۔ یہ باری باری سورج کے سامنے

اگر ہمیں دھوپ سے بچاتے تھے۔ ہم کھڈ نالے، ٹیلے، گھاٹیاں اور نشیب و فراز پھلانگتے دُور نکل گئے۔ ہمارے علاقے میں کبھی کبھی جنگلی بلّی نظر آیا کرتی تھی۔ میں آپ کو ایک جنگلی بلّے کی کہانی سنا چکا ہوں۔ جنگلی بلّی ہمارے گھروں میں رہنے والی بلّی سے کم و بیش دُگنی ہوتی ہے۔ اسے اگر آپ چھوٹے سائز کا شیر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جنگلی بِلّا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ انسان پر حملہ تو نہیں کرتا لیکن اس کے بچّے خطرے میں آ جائیں یا خود گھیرے میں آ جائے تو اس کا حملہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے۔

ہم خاصی دُور نکل گئے تھے۔ کُتّوں کو ہم نے کھُلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جگہ کٹی پھٹی تھی اور کھڈ زیادہ تھے۔ ہم ایک نشیب کے اُوپر گئے تو کوئی پچاس گز دُور ہمیں ایک جنگلی بِلّا کسی چھوٹے جانور کے پیچھے دوڑتا دکھائی دیا۔ وہ جانور خرگوش نہیں تھا۔ بِلّا اپنے شکار کے تعاقب میں اتنا مگن تھا کہ اُس نے اِدھر دیکھا ہی نہیں کہ آٹھ نو کُتّے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے اُس کا شکار بھی دیکھ لیا۔ وہ ایک جنگلی چوہا تھا۔ جنگلی چوہے گھروں میں پائے جانے والے چوہوں سے بہت بڑے ہوتے ہیں۔

بِلّے نے چوہے کو پکڑ لیا اور اُسے منہ میں لے کر ایک طرف چل پڑا۔ ہمارے ایک کُتّے نے اُسے دیکھ لیا اور اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ دوسرے کُتّوں کو پتہ چلا تو وہ بھی اپنے ساتھی کے پیچھے ہوا ہو گئے۔ بِلّے نے رُک کر کُتّوں کو دیکھا اور اپنے شکار کو منہ میں لیے ہوئے بھاگ اُٹھا۔ قریب کوئی درخت ہوتا تو بِلّا اُس پر چڑھ جاتا مگر وہ بنجر زمین تھی۔ وہاں کوئی درخت نہ تھا۔ کتّوں کی رفتار تیز تھی۔ بِلّا کچھ دُور تک دوڑتا اُچھلتا نظر آتا رہا پھر غائب ہو گیا۔ کُتّے اُس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی غائب ہو گئے جیسے انہیں زمین نے نگل لیا ہو۔

ہم سب دوڑتے ہوئے وہاں تک پہنچے جہاں کُتّے غائب ہو گئے تھے۔ وہاں ایک گہرا کھڈ تھا۔ یہ پندرہ سولہ فٹ گہرا تھا۔ اس کے کنارے ڈھلانی تھے۔ ایک طرف اس میں اتنا سا راستہ تھا کہ ایک آدمی اس میں سے گزر سکتا تھا۔ اس کھڈ کی چوڑائی تیس چالیس فٹ کے درمیان تھی۔ جنگلی بِلّا اس میں اُتر گیا تھا اور کُتّے بھی کھڈ میں چلے گئے تھے۔ آٹھ نو کُتّوں میں اکیلا بِلّا کیا کر سکتا تھا لیکن وہ جنگلی

تھا اور پوری طرح خونخوار ہو گیا تھا۔ وہ نکل بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ ہم اُوپر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

بِلّا کھڈ سے نکلنے کے لیے اُدھر جاتا تھا جدھر تنگ سا راستہ تھا تو ایک دو کُتّے راستہ روک لیتے تھے۔ وہ کھڈ کی ڈھلان سے اُوپر آنے کی کوشش کرتا تو کوئی نہ کوئی کُتّا اُس پر حملہ کر کے اُسے کھڈ میں گرا لیتا۔ وہ جب دانت نکال کر غرّاتا تو کُتّے پیچھے ہٹ آتے تھے۔ وہ خاصا بڑا بِلّا تھا۔ وہ جس کُتّے کے منہ پر پنجہ مارتا وہ کُتّا دوسری بار اُس کے سامنے نہیں جاتا تھا۔ اُس کے پیچھے یا پہلو کی طرف جا کر حملہ کرتا تھا۔

جب بِلّے نے دیکھا کہ اُس کے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں تو وہ بڑی خوفناک آواز سے غرّایا اور اُچھل کر کھڈ کی ڈھلان پر اُس طرف چپک گیا جو ڈھلانی نہیں بلکہ دیوار کی طرح عمودی تھی۔ تمام کُتّے اُس کے نیچے اکٹھے ہو کر اُوپر کو اُچھلنے لگے۔ بِلّا اوپر سے تیر کی طرح کتّوں پر آیا اور کتّوں میں غائب ہو گیا۔ ایک کُتّے کی ایسی چیخیں اور ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ بڑی سخت مصیبت میں پھنس گیا ہو۔ اس آواز کو کُتّے پہچانتے تھے۔ یہ خطرے کی آواز ہوتی ہے۔ ہمارے کُتّے کھڈ کے اندر بکھر کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔

ہم نے دیکھا کہ بِلّا ہمارے ایک کُتّے کے کندھوں پر سوار تھا اور اُس نے کتّے کی گردن منہ میں لے رکھی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بِلّے کے ناخن کُتّے کی کھال میں اُترے ہوئے ہیں۔ کتّا چیخ اور تڑپ رہا تھا۔ بِلّے نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ ہم نے اُوپر سے کتّوں کو اُس زبان میں للکارا جو زبان وہ سمجھتے تھے۔ سب سے پہلے افضل کا بُوملی بِلّے کی طرف دوڑا لیکن بِلّے نے کُتّے کو چھوڑ دیا اور وہ ایک ہی جست میں اُس جگہ جا پڑا جہاں کھڈ سے نکلنے کا تنگ سا راستہ تھا۔ اُس نے سنبھل کر کتّوں کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔ کُتّے ایک دوسرے کے پیچھے باہر نکلے اور بِلّے کے تعاقب میں چلے گئے لیکن بِلّا تھوڑی دُور تک نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔ کُتّے ایک جگہ رُک گئے۔ وہاں شاید اُس کا بِل تھا جس میں وہ چلا گیا تھا۔ وہ ہمارے ایک کُتّے کو زخمی کر گیا تھا۔

بِلّا کتوں کے ساتھ ہمارا لہو بھی گرم کر گیا۔ ہم اور آگے جانا چاہتے تھے آگے ایک جگہ تھی جہاں سہہ رہتے تھے۔ سہہ کا شکار کتوں کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ اُس کے لمبے لمبے کانٹے کتوں کے منہ لہولہان کر دیتے ہیں لیکن ہمیں سہہ کے شکار میں زیادہ لطف آتا تھا۔ ہم ایک کس میں سے گذر کر اور آگے چلے گئے۔

بھوک نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ایک بڑی اچھی جگہ نظر آئی۔ دو گھنے درخت تھے۔ ہم ان کے نیچے بیٹھ گئے اور سب نے اپنا اپنا کھانا درمیان میں بچھائی ہوئی چادر پر رکھ دیا۔ کھانا کھا کر اُٹھے تو مغرب کی طرف دیکھا۔ سیاہ گھٹا چڑھی آ رہی تھی۔ وہ زمین اُونچی تھی جہاں ہم کھڑے تھے۔ مغرب کی طرف اُفق تک اپنا علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ علاقہ پرچ کی شکل کا ہے۔ اُس زمانے میں آبادی بہت کم تھی۔ دُور دُور کے گاؤں نظر آ رہے تھے۔ ساری زمین سبزہ زار تھی۔ اس کے پس منظر میں کالی گھٹا بہت اچھی لگ رہی تھی۔

گھٹا کے نیچے زمین تک سفید سی دُھند تھی جو آگے بڑھی آ رہی تھی۔ یہ بارش تھی۔ ہمارے علاقے میں ساون کی بارش کا یہی انداز ہے۔ گھٹا کے نیچے بارش آگے ہی آگے آتی دکھائی دیتی ہے اور لوگ مولیشی وغیرہ اندر کر لیتے ہیں۔ بارش کی آمد کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ ہم گھٹا اور بارش کو آتا دیکھ کر خوش ہوئے کہ بارش میں نہاتے واپس جائیں گے لیکن اِس بارش کے ساتھ ایک دشواری یا مصیبت بھی آ رہی تھی ـــــ یہ تھے دو کس (برساتی نالے) جو ہمارے راستے میں تھے۔ بارش چونکہ اُدھر سے آ رہی تھی جدھر سے کس آتے تھے اس لیے سیلاب کو بارش کے ساتھ ہی آ جانا تھا۔ یہ بڑا تیز سیلاب ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا کر سیلاب ختم کر دیئے گئے ہیں، ہمارے وقتوں میں سیلاب غراتے آتے تھے اور چھ سات گھنٹوں بعد ان کا زور ٹوٹ جاتا تھا۔

ہم نے سہہ کے شکار کے لیے آگے جانا منسوخ کر دیا اور واپس چل پڑے۔ گھٹا بہت تیزی سے آ رہی تھی اور اس کے نیچے بارش کا جو سفید پردہ تھا اُس کے پیچھے ہمارا علاقہ چھپتا جا رہا تھا۔ ایسی بارش سے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ

ندی نالوں میں بہت زیادہ سیلاب آئے گا۔

ہم ایسی جگہ جا رہے تھے جس کے دائیں طرف زمین ختم ہو جاتی تھی۔ آٹھ دس گز کا خلاء تھا۔ اس سے آگے زمین پھر اُونچی ہو جاتی تھی۔ یہ خلا گلی کی شکل کی گہرائی تھی۔ اسے دیکھو تو یوں لگتا تھا جیسے مکان کی منڈیر سے نیچے گلی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس گلی کی دیواریں (دَندیاں) کٹی پھٹی تھیں۔ یہ گلی کم و بیش چالیس گز لمبی تھی اور آگے ایک نشیب میں چلی جاتی تھی۔ اس میں درخت بھی تھے۔

ہم اُوپر جا رہے تھے۔ ہمارا ایک دوست ویسے ہی گہرائی لیعنی گلی کی طرف چلا گیا۔ اُس نے ہمیں آکر بتایا کہ نیچے ایک آدمی ہے اور اُس کے ساتھ ایک عورت ہے جو شاید جوان لڑکی ہے۔ ہم میں سے کسی نے بھی دلچسپی نہ لی۔ وہ دونوں مشکوک بھی ہو سکتے تھے۔ میاں بیوی بھی ہو سکتے تھے جو کہیں جا رہے ہوں گے۔ ہمیں گاؤں پہنچنے کی جلدی تھی۔ ہم چلتے گئے۔

نواب دین نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہ دیکھے گا کہ یہ کون ہیں۔ اتنے میں بارش کے بڑے موٹے قطرے گرنے لگے۔ نواب دین اُدھر چلا گیا اور اُس نے اس طرح بیٹھ کر نیچے جھانکا کہ نیچے سے اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ وہ بیٹھے بیٹھے پیچھے کو سرکا، پھر اُٹھا اور ہمارے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ وہ علیا ہے اور اُس کے ساتھ کوئی عورت نہیں۔

"میں اس کے ساتھ دو باتیں کرنا چاہتا ہوں" ـــ نواب دین نے کہا ـــ اُس سے پوچھوں گا کہ تمہاری میرے ساتھ کیا دشمنی ہے کہ تم حوالدار کے کہنے پر میرے گھر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو؟"

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو علیا کو گھیرتے ہیں۔ وہ آخر چور ہی ہے، کوشش کریں گے کہ ہماری بات مان لے اور حوالدار کی سازش سے ہٹ جائے میرے ساتھیوں نے میری بات پسند کی۔ نیچے جانے کے لیے ہمیں خاصا آگے یا پیچھے جانا تھا جہاں سے زمین نیچے اُترتی تھی۔ بارش یکلخت تیز ہو گئی اور موسلادھار۔ ہم آگے چلے گئے اور ایک گھاٹی اُترے۔ دائیں کو مڑے اور دو "دندیوں" کے درمیان چلے گئے۔ ایک درخت کے نیچے علیا کھڑا تھا۔ اُسے

میرے جس ساتھی نے پہلے دیکھا تھا وہ حیران ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ اُس نے ایک عورت دیکھی تھی، وہ کہاں گئی؟

ہم علیا کے پاس جا رُکے۔ اُس نے اپنی مسکراہٹ سے کہا کہ تمہارا شکار بارش نے خراب کر دیا ہے۔ ہم میں سے ابھی کوئی بھی نہ بولا کہ نواب دین بول پڑا۔

"علیا!" — نواب دین نے کہا — "تم میرے گھر پر دو ہلّے کر چکے ہو۔ تمہاری ابھی کچھ زندگی باقی ہے"۔

"او نوابے!" — علیا نے نواب دین کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور بڑے پیار سے کہا — "میں؟ ..... میں اور تیرے گھر پر ہاتھ ماروں گا؟ کون سے ہلّے کی بات کر رہے ہو؟"

"پولیس حوالدار کی یاری تمہیں بہت خراب کرے گی علیا!" — نواب دین نے اُس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا — "تمہیں ضرور میرے ہی ہاتھوں مرنا ہے"۔

بارش اور تیز ہو گئی۔ ہمارے دو کتّوں نے بیک وقت ایک طرف دیکھ کر زنجیروں سے آزاد ہونے کے لیے زور لگایا۔ ہم نے اُدھر دیکھا۔ ایک بہت لمبی گوہ دوڑی آ رہی تھی۔ وہ اس گلی کی دیوار میں جہاں دیوار پھٹی ہوئی تھی، گھس گئی۔ وہ شکار کا موقع نہیں تھا۔ یہ گوہ کا گھر تھا۔ گوہ گھر سے کہیں دُور ہو گی۔ اب بارش سے بھاگ کر اپنے گھر بھاگی آئی تھی۔ وہاں خاصا فراخ شگاف تھا۔ ڈنڈی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے اندر گوہ کا بل ہو گا۔

ہم نے اُدھر سے توجہ ہٹا لی۔ ہم سب علیا کو شرمسار اور ذلیل کرنا چاہتے تھے لیکن کسی بچے یا عورت کی چیخ نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم سب نے اُدھر دیکھا۔ ایک جوان لڑکی ڈنڈی کے شگاف سے باہر آ رہی تھی۔ اُس نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی جو سر سے اُتر گئی تھی۔ لڑکی دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی اور چار پانچ قدم ہم سے دُور رُک گئی۔ اُس نے چادر سر پر لے لی اور حیرت اور گھبراہٹ سے اُس کی آنکھیں بہت زیادہ کھُل گئیں۔

"اوئے!" — ہمیں نواب دین کی آواز سنائی دی — "یہ تو فروزاں ہے"۔

لڑکی خوبصورت تھی۔ وہ وہیں سے پیچھے کو مڑی اور بھاگ اُٹھی۔ یہ تھی وہ عورت جسے ہمارے ایک ساتھی نے علیا کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ علیا نے ہمیں دُور سے دیکھ لیا تھا اس لیے وہ ہم سے چھُپے رہنے کے لیے اس قدرتی گلی میں چلا گیا تھا۔ یہاں اُس نے محسوس کر لیا ہو گا کہ ہم اُسے دیکھ لیں گے اس لیے اُس نے لڑکی کو شگاف میں بھیج دیا تھا۔

نواب دین نے ہمیں بہت تیز بولتے ہوئے بتایا کہ فروزاں اُس پولیس حوالدار کی چھوٹی بہن ہے جس نے علیا کو نواب دین کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لیے دوست بنایا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ حوالدار کی بہن کو بھگا لے جا رہا تھا۔ وہاں سے لڑکی کا گاؤں تقریباً چار میل دُور تھا۔ اتنی دُور وہ لڑکی کو سیر کرانے تو نہیں لایا تھا۔ نواب دین نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ علیا پولیس حوالدار کے گھر جاتا رہتا ہے۔ علیا اُستاد تھا۔ اُس کے چہرے اور قد بُت میں مردانہ کشش تھی اور اُس کی زبان میٹھی اور شگفتہ تھی۔ لڑکی اُس کے جال میں آ گئی۔

لڑکی جس کا نام فروزاں تھا، ہمیں دیکھ کر پیچھے کو بھاگ اُٹھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ پانچ سات سکینڈ میں ہو گیا۔ بارش بڑی تیز اور موسلا دھار تھی۔ نواب دین نے ہمیں کہا کہ تم اِسے (علیا کو) پکڑ لو، میں فروزاں کو پکڑتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دوڑ پڑا۔ ہم نے علیا کو گھیر لیا اور اُسے کہا کہ ہمارے ساتھ چلے۔ اُس نے ہنسی مذاق کے لہجے میں ہمیں ٹالنے کی کوشش کی۔ اُس نے ہمیں یہ بھی کہا کہ ہم اس چکّر میں نہ پڑیں۔

علیا کوئی بہت بڑی اور قابلِ احترام شخصیت تو نہ تھا کہ ہم اُس پر ہاتھ ڈالتے ڈر جاتے۔ ہم نے اُسے اپنے ساتھ لے لیا۔

"دیکھو لڑکو!" — علیا نے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کہا — "نواب سے کہو کہ فروزاں کو بھول جائے۔ میں اُس کے گھر واردات نہیں کروں گا"۔

"تم دو دفعہ کوشش کر چکے ہو" — راجہ شاہباز خان نے کہا۔

"ہاں دوستو!" — اُس نے کہا — "دونوں دفعہ دو آدمی ساتھ تھے لیکن

نواب کا کُتا بڑا زبردست ہے .... اب نہیں کروں گا۔"

"علیا!" میں نے اُسے کہا — "تم ہو کیا؟ کسبی ہونا! چوری چکاری تمہارا پیشہ ہے۔ ہم تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہیں یہاں پھینک جائیں گے تو کوئی ہمیں پوچھے گا نہیں۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتا دو تم اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے تھے۔"

"بس لے جا رہا تھا" — اُس نے ہنستے ہوئے کہا — "ہم دونوں واپس آنے کے لیے نہیں جا رہے .... ہمیں جانے دو۔"

بارش کچھ بولنے سننے نہیں دیتی تھی اور کیچڑ چلنے نہیں دیتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ علیا کی لوگ عزّت ہی کرتے ہوں گے مگر ہم اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ نواب دین لڑکی کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اُسے اپنے دشمنوں کی جوان لڑکی بڑی غلط جگہ مل گئی تھی۔ یہ جگہ لڑکی کے لیے غلط تھی لیکن نواب دین کے لیے موزوں تھی۔ اُسے اپنی دشمنی کی تسکین کرنی تھی۔ لڑکی اپنے گھر جا کر شکایت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ شکایت کرتی تو گھر والے اُس سے پوچھتے کہ وہاں تم لینے کیا گئی تھیں۔

ہم اس گلی سے جو دراصل پھٹی ہوئی زمین تھی، نکلے۔ آگے زمین اونچی نیچی تھی۔ اونچی جگہوں سے پانی نیچے آ رہا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو گز دُور ہمیں لڑکی کھڑی نظر آئی۔ بارش میں وہ صاف نظر نہیں آتی تھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ کوئی لڑکی کھڑی ہے۔ نواب دین اُس سے تھوڑا ہی دُور رہ گیا تھا۔ لڑکی کبھی پیچھے دیکھتی کبھی آگے۔

ہم میں سے کسی نے کہا کہ آگے کَس ہے۔ مجھے یاد آیا کہ وہاں برساتی نالہ تھا۔ اس میں سے ہم گزرے تھے۔ وہاں اس کا پاٹ بہت تنگ اور کنارے دیواروں کی طرح اُونچے تھے۔ اس کے موڑ قریب قریب تھے۔ اگر اس میں سیلاب آ چکا تھا تو لڑکی اس میں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ سیلاب کی گہرائی پاٹ تنگ ہونے کی وجہ سے کتنی زیادہ اور اس کی تیزی کتنی ہو گی۔ یہ بھینسے کو بھی بہا لے جاتی۔

ہم اُدھر ہی جا رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ نواب دین فروزاں کے قریب

پہنچ گیا۔ ہم بارش، کیچڑ اور پھسلن میں جتنا تیز چل سکتے تھے چلے اور لڑکی سے کچھ ہی دُور جا پہنچے۔ لڑکی نے آخری بار پیچھے دیکھا اور وہ نالے میں کُود گئی — نواب دین کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑا اور اُس نے بھی نالے میں چھلانگ لگا دی۔ ہم دوڑ پڑے۔ پھسلے گرے اور اُٹھ کر دوڑے اور کنارے پر چلے گئے۔ نیچے سیلاب سخت غصّے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بارش اُوپر سے برستی آئی تھی اس لیے سیلاب اس کے ساتھ ہی آ گیا تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ موجیں اُوپر اُٹھتی اور ایک دوسری پر سوار ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس سیلاب میں قہر اور غضب تھا۔

ہم نے فروزاں کو دیکھا۔ کبھی اُس کا سر نظر آتا، کبھی وہ ڈوب جاتی اور اُس کے ہاتھ اُوپر آ جاتے جیسے ہوا کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اُس سے تھوڑا ہی دُور نواب دین اُس کی طرف تیر رہا تھا لیکن سیلاب کی موجیں اُسے اُٹھا کر پرے پھینک دیتی تھیں۔ آگے کَس کا موڑ تھا جس کا زاویہ نوّے درجے سے کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ ایسے موڑ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ سیلاب سامنے کے بلند کنارے سے ٹکرا کر مُڑتا ہے تو بھنور پیدا ہوتے ہیں۔ آگے سے کنارا سیلاب کو روکتا ہے، پیچھے سے موجیں موجوں کو دھکیلتی ہیں۔ وہاں پانی گہرا بھی ہو جاتا ہے۔

ہمیں اُمید نہیں تھی کہ فروزاں زندہ نکلے گی۔ اُس کا ڈوبنا یقینی تھا۔ نواب دین کا ہمیں فکر نہ تھا۔ وہ جوان تھا اور اُس کے جسم میں طاقت تھی۔ البتہ اُس پر مجھے غصّہ آ رہا تھا۔ وہ دشمنی کی خاطر دشمنوں کی لڑکی کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اُسے وہ خراب کرنا چاہتا تھا، یا وہ لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ دیکھو میں نے دشمنوں کی جوان لڑکی کہاں اور کس کے ساتھ پکڑی ہے، مگر لڑکی اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لڑکی نے سیلاب میں کُود کر بھاگنے کی نہیں، خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اُسے خودکشی ہی کرنی چاہیئے تھی۔ نواب دین کی نیّت جو کچھ بھی تھی، اُس نے اس قسم کے سیلاب میں کُود کر دلیری اور بہادری کا معمولی کارنامہ نہیں کیا تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ جرأت کی ضرورت تھی۔

بارش اور کیچڑ کی وجہ سے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ زمین ہموار نہیں تھی۔ ہم وہاں کھڑے تماشہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ زمین میں کھڈے بھی تھے۔ ہم پھسلتے اور گرتے

کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتے گئے۔ ہمارا ہر ساتھی کوئی نہ کوئی مشورہ دے رہا تھا۔ ہم اور آگے گئے تو ہمیں کَس کا وہ حصّہ نظر آنے لگا جو موڑ سے آگے تھا۔ اسے دیکھ کر جان میں جان آئی۔ موڑ سے کچھ دُور آگے کَس کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا تھا اور کناروں کی بلندی کم ہو گئی تھی۔ سیلاب اتنا پھیل گیا تھا کہ اس کا قہر اور غضب بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ گہرائی بھی نہیں رہی تھی۔

ہم دُور نہیں تھے لیکن بارش، کیچڑ اور کھڈوں والی اونچی نیچی زمین چلنے نہیں دیتی تھی۔ بارش کی دُھند میں نظر تھوڑی دُور تک ہی دیکھ سکتی تھی۔ آخر ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہمیں نواب دین اور فروزاں نظر آنے لگے تھے۔ نواب دین نے فروزاں کو بازوؤں پر اٹھایا ہُوا تھا۔ معلوم نہیں وہ زندہ تھی یا نہیں۔ اُس کا سر پیچھے کو ڈھلکا ہُوا اور ایک بازو لٹک رہا تھا۔ ہم ایک جگہ سے پانی میں اُتر گئے۔ پانی ہمارے کُولھوں تک تھا۔ ذرا چھوٹے قد کے لڑکوں کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ پاؤں ذرا مشکل سے جمتے تھے۔ کتّے ہمارے ساتھ تھے۔ کتّا تیر سکتا ہے لیکن ہم نے کُتّوں کو اٹھا لیا تاکہ جلدی پار چلے جائیں۔

شکار میں ہمیں بڑے خطرناک تجربے بھی ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ آپ کو سنا چکا ہوں، لیکن یہ تجربہ بڑا ہی عجیب تھا۔ پانی میں سے گزرتے مجھے علیا کا خیال آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ علیا کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بڑی بلند آواز میں پوچھا کہ علیا کہاں ہے۔ ایک تو بارش کا شور تھا، دوسرے سیلاب کا شور۔ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ تمام ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور علیا کے متعلق پوچھا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا۔

"بھاگ گیا ہے" — ایک آواز آئی۔

"ہاتھ سے نکل گیا ہے" — کسی اور نے کہا۔

"نکل گیا.... نکل گیا" — کئی آوازیں اُٹھیں۔

اُسے نکل بھاگنے کا بڑا اچھا موقعہ مل گیا تھا۔ ہم اپنے ساتھی نواب دین کو سیلاب میں دیکھ رہے تھے اور وہ نکل گیا۔ مجھے خیال آیا کہ لڑکی نواب دین کے دشمنوں کی ہے اور وہ جس کے ساتھ آئی تھی وہ غائب ہو گیا ہے۔ مجھے

خطرہ یہ نظر آنے لگا کہ لڑکی کے لواحقین نواب دین پر الزام تھوپ دیں گے کہ وہ لڑکی کو ورغلا کر لے گیا تھا۔ مجھے لڑکی کے لواحقین کا اور اُس بھائی کا جو پولیس حوالدار تھا، کوئی ڈر نہ تھا۔ میرا کوئی ایک بھی ساتھی ڈرنے والا نہیں تھا۔ مجھے اپنے بزرگوں کا خیال آتا تھا کہ وہ کہیں گے کہ ہم نے خواہ مخواہ کسی کے ساتھ دشمنی پیدا کر کے انہیں شرمسار کیا ہے۔

ہم جب پار پہنچے تو نواب دین فروزاں کو زمین پر لٹا کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اپنا وزن ڈال رہا تھا۔ فروزاں کے منہ اور ناک سے پانی نکل رہا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے فروزاں کے پہلوؤں کو اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ فروزاں کے منہ سے اور زیادہ پانی نکلا۔ اس طرح دبا دبا کر اُس کے پیٹ اور پھیپھڑوں سے پانی نکال دیا گیا۔ اُس نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ یکلخت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ اور دہشت تھی۔ اُس کی جسمانی حالت اتنی خراب تھی کہ اُس کے لیے اُٹھنا مشکل ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ جس خطرناک صورتِ حال میں پھنس گئی تھی، اس نے اُسے طاقت دے دی اور وہ پھر سیلاب کی طرف دوڑ پڑی۔

نواب دین کی جسمانی حالت بھی صحیح نہیں تھی۔ اُس نے اپنی ہمت سے زیادہ زور لگایا تھا ورنہ اتنے زبردست سیلاب کے خلاف لڑنا ناممکن ہوتا۔ وہ اتنا ہانپا ہوا تھا کہ اُس کی سانسیں آپس میں نہیں مل رہی تھیں، پھر بھی اُس نے دوڑ کر فروزاں کو پکڑ لیا۔ ہم میں سے کوئی بھی لڑکا اُسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اُس کی چادر سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ گرمیوں کے موسم کی وجہ سے اُس نے باریک کپڑے پہن رکھے تھے جو بھیگ کر اُس کے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ اس طرح وہ برہنہ لگتی تھی۔

نواب دین نے اُسے پکڑ لیا تھا۔ وہ چلّا چلّا کر کہتی تھی — "مجھے مر جانے دو۔ مجھے ڈوب جانے دو۔"

ہم میں سے کسی نے اُسے پکڑا تو نہیں ہم نے اُن دونوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

"ہم اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں ڈوبنے نہیں دیں گے" — ہم میں سے

کسی نے کہا۔

"مجھے تم سب سے ڈر آتا ہے" ـــــ اُس نے روتے ہوئے کہا ـــــ "یہ (نواب دین) ہمارا دشمن ہے۔ میں جانتی ہوں یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ تم سب اس کے دوست ہو۔"

یہی ڈر ہمیں تھا لیکن نواب دین نے فروزاں کا ڈر ختم کر دیا۔

"دیکھ فروزاں!" ـــــ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ـــــ "میری دشمنی تمہارے خاندان کے مردوں کے ساتھ ہے۔ میں مرد ہوں۔ مرد کا بچہ ہوں۔ میں ایک عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچاؤں گا اور تمہارے باپ کو صرف یہ لفظ کہوں گا کہ چوروں کی یاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔"

فروزاں نے گھبرا کر اپنی کمر کے اردگرد اپنے ہاتھ یوں پھیرے جیسے اُس کی کوئی چیز گر پڑی ہو۔

"وہ کہاں ہے؟" ـــــ اُس نے گھبراہٹ میں پوچھا اور ہم میں علیا کو دیکھنے لگی۔ اُس نے کہا ـــــ "وہ چور ہی نکلا۔ میرے پیچھے کیوں نہیں آیا؟ بُزدل بھاگ گیا ہے۔ میرا سارا زیور لے گیا ہے۔"

یہ واقعہ اگر میں تفصیل سے سناؤں تو بہت لمبا ہے۔ مختصر یہ کہ نواب دین نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوگی۔ ہم سب نے مشکل سے اُس پر قابو پایا اور اُس کا ڈر دُور کیا۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑی۔ بارش کا زور ذرا کم ہو گیا تھا۔ ہم اُس کے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ گھاٹیاں اترنا اور چڑھنا بہت ہی مشکل تھا۔ لڑکی کو سہارا دے دے کر چڑھایا اور اتارا۔

اُس نے کئی بار ہماری منت کی کہ ہم کسی کو نہ بتائیں کہ ہم نے اُسے کہاں سے پکڑا تھا۔ پھر اُس نے بتا دیا کہ علیا نے اُس کے گھر آنا اور ہر بار بہت دیر تک وہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ علیا اُس کے دل پر قابض ہو گیا۔ وہ فروزاں کو اتنا اچھا لگا کہ وہ دو تین دن نہ آتا تو فروزاں بے چین ہو جاتی۔ فروزاں کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی شادی ایسے نوجوان کے ساتھ طے ہو چکی تھی جو اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

فروزاں نے علیا کو گھر سے باہر ملنا شروع کر دیا اور وہ علیا کے ساتھ گھر سے بھاگنے کے لیے تیار ہو گئی۔ رات کو گھر سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے دن کا وقت مقرر کر لیا۔ فروزاں نے وہ تمام زیور جو اُس کے لیے بنایا گیا تھا، سمیٹا، کچھ رقم نکالی اور گھر کوئی بہانہ بنا کر نکل گئی۔ علیا ایک جگہ انتظار میں کھڑا تھا۔ ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ چھپنے کے لیے کہیں دُور نہیں جانا پڑتا۔ دیہاتی علاقے میں آدمی تھوڑا سا پرے چلا جائے تو غائب ہو جاتا ہے۔ علیا اور فروزاں بھی غائب ہو گئے۔ علیا نے اُسے یقین دلایا تھا کہ وہ اُسے ایسی جگہ لے جا رہا ہے جہاں اُن تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اور وہ بڑے مزے سے زندگی گذاریں گے۔

گاؤں سے تھوڑی دُور جا کر فروزاں نے زیور اور پیسوں والی پوٹلی علیا کو دے دی۔ آگے گئے تو اس کَس میں سے گذرے جس میں بعد میں سیلاب آ گیا تھا، دونوں اُوپر اُوپر جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے دُور سے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ نیچے اُس گلی میں داخل ہو گئے جو زمین کا بہت بڑا کٹاؤ تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ایک ساتھی نے انہیں نیچے جاتے دیکھ لیا تھا۔ ہم اُن کے بالکل اُوپر سے گذر رہے تھے اس لیے انہیں ہماری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ علیا نے فروزاں کو ونڈی کے شگاف میں چھپ جانے کو کہا۔ اُس نے فروزاں کو ہم سے چھپایا اور فروزاں سے کہا تھا کہ یہ لوگ آگے چلے جائیں گے تو وہ اُسے آگے لے جائے گا۔ وہ خود باہر رہا۔ اُسے اکیلا دیکھ کر کوئی شک نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو گھومنے پھرنے والا آدمی تھا۔

اس کے فوراً بعد بارش شروع ہو گئی۔ ایک گوہ بارش سے ڈرتی اپنے گھر کو دوڑی آئی۔ اُس کے گھر کے منہ پر فروزاں چھپی کھڑی تھی۔ اُس نے گوہ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ڈر سے اُس کی چیخ نکل گئی اور وہ باہر کو بھاگی۔ آگے ہم کھڑے تھے۔ اُس نے نواب دین کو پہچان لیا تھا۔ وہ پیچھے کو بھاگ اُٹھی۔ وہ دراصل اپنے گھر پہنچنے کے لیے بھاگی تھی۔ اُس نے سوچا یہ تھا کہ گھر جا کر کہے گی کہ جہاں وہ گئی تھی وہاں سے واپس آتے بارش آ گئی اور وہ بھیگتی آئی ہے لیکن کَس کی ونڈی پر پہنچی تو سیلاب آ چکا تھا اور یہ بڑا خوفناک سیلاب تھا۔ فروزاں کے دماغ میں اچانک آئی کہ

ڈوب مرے۔ چنانچہ وہ سیلاب میں کود گئی مگر نواب دین نے اُسے بچا لیا۔

اب وہ زیور اور پیسوں کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ پوٹلی علیا کے پاس تھی۔ وہ کہتی تھی کہ علیا اُسے دھوکہ نہیں دے گا لیکن وہ آخر چور ہے۔ اُس کا کیا بھروسہ!

بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ میں نواب دین کے روّیے پر حیران ہو رہا تھا۔ وہ فروزاں کو تسلیاں دے رہا تھا۔ ہم تو کہتے تھے کہ وہ فروزاں کو خراب کرے گا۔ ہم گرتے پڑتے فروزاں کے گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ گاؤں اُوپر تھا اور ہم اُونچی زمین کی اوٹ میں تھے۔ نواب دین نے ہمیں وہیں روک لیا۔

"دیکھو دوستو!" — اُس نے ہمیں کہا — "اگر میں اِسے (فروزاں کو) اپنے ساتھ اس کے گھر تک لے جاؤں گا تو اس کے گھر والے نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ دوسرا خدشہ یہ ہے کہ گاؤں میں اِس کے ساتھ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو اس کی اور اس کے خاندان کی بے عزّتی ہو گی.... تم میں سے کوئی اس کے گھر جائے اور اس کے باپ کو ساتھ لے آئے۔ اگر اس کا باپ آ گیا تو میں اُسے بتاؤں گا کہ کسی کو پتہ چل گیا کہ فروزاں باہر سے آئی ہے تو وہ کیا کہے۔"

ہمارا دوست افضل جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ فروزاں نے اُسے اپنے گھر کی نشانیاں بتائیں۔ خوش قسمتی سے اُس کا گھر گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ میں نے نواب دین کے کان میں کہا کہ اس کے باپ کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ اِسے کہو کہ خود ہی چلی جائے۔

"میں اِس کے باپ کو ایک بات کہنا چاہتا ہوں" — نواب دین نے کہا۔

افضل گیا اور فروزاں کا باپ اُس کے ساتھ آ گیا۔ اپنی بیٹی کو ہمارے ساتھ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے ہم سب کو دیکھا۔

"حیران نہ ہو چاچا!" — نواب دین نے اُسے کہا — "تمہاری بیٹی تمہیں خود بتائے گی کہ اسے ہم کس طرح لائے ہیں۔ میں صرف یہ بتاتا ہوں کہ اِسے ہم نے علیا کنجی کے ساتھ پکڑا ہے۔ اِس سے پوچھو کہ زیور اور رقم کہاں ہے جو یہ گھر سے لے جا رہی تھی۔ میں تمہیں ایک ہی بات کہوں گا چاچا! اپنوں سے دشمنی اور چوروں

سے یاری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ تمہارے حوالدار بیٹے نے میرے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لیے علیا کو دو بار بھیجا تھا لیکن وہ دونوں بار بھاگ آیا۔ علیا چور ہے۔ اُس نے تمہارے ہی گھر ڈاکہ ڈالا ہے۔ وہ تمہاری عزّت کا ڈاکو ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ فروزاں کے باپ کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا تھا۔ فروزاں آگے بڑھ کر باپ کے پاؤں پر گر پڑی اور اُس کے پاؤں پر ماتھا رگڑنے لگی۔ باپ نے بڑی زور سے اُسے لات ماری۔ نواب دین اُس کے باپ کے آگے ہو گیا۔

"نہ چاچا!" — نواب دین نے کہا — "اس طرح سارے گاؤں میں بدنام ہو جاؤ گے۔ جسے نہیں پتہ اُسے بھی پتہ چل جائے گا کہ فروزاں کو باپ نے مارا پیٹا ہے۔ لوگ باتیں گھڑ لیں گے۔ بارش برس رہی ہے۔ اسے ساتھ لے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو کہنا کہ لڑکی کھیتوں کو چلی گئی تھی۔ اُوپر سے بارش آ گئی اور میں اسے ساتھ لے آیا ہوں.... اور چاچا! میں قرآن پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا کہ تمہاری بیٹی کو ہم کہاں سے پکڑ کر لائے تھے۔"

باپ کی یہ حالت تھی کہ اُس کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے گیا۔ نواب دین اپنے گاؤں چلا گیا اور ہم اپنے گاؤں آ گئے۔ نواب دین کے کردار کی عظمت دیکھیں کہ اُس نے فروزاں کے باپ کو بتایا تک نہیں کہ اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر فروزاں کو بچایا ہے۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد نواب دین ہمارے گاؤں آیا۔ اُس نے سنایا کہ آٹھ دس دن گذرے، ایک آدمی نے اُسے بتایا کہ فروزاں کا بھائی پولیس حوالدار اُسے ملنے آیا ہے اور گاؤں سے باہر کھڑا ہے۔ وہ گاؤں میں نہیں آنا چاہتا۔ نواب دین کو شک ہُوا کہ وہ اُس پر وار کرنے آیا ہے۔ نواب دین کلہاڑی لے کر چلا گیا۔ پولیس حوالدار نے اُسے گلے لگایا اور کہا کہ وہ چھٹی آیا ہے اور اُسے پتہ چلا ہے کہ نواب دین نے اُس کی عزّت کس طرح بچائی ہے اور اُس کے خاندان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ نواب دین نے اُسے بھی کہا کہ چوروں کی یاری کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

"میں دشمنی ختم کرنے آیا ہوں" — پولیس حوالدار نے کہا — "تم یوں کرو کہ

اپنے ماں باپ سے کہو کہ میرے گھر آئیں اور فروزاں کا رشتہ مانگیں۔ ہم فوراً ہاں کر دیں گے۔"

"میں نے فروزاں کو اس لیے نہیں بچایا تھا کہ مجھے اس کا رشتہ مل جائے گا"۔۔۔ نواب دین نے کہا ۔۔۔ "میں نے اُسے دل میں بہن کا درجہ دے کر ہاڑ (سیلاب) سے نکالا تھا اور بہن کا درجہ دے کر ساتھ لایا تھا۔ مرد کی دشمنی مرد کے ساتھ ہوتی ہے۔ عورت کے ساتھ کیا دشمنی؟"

نواب دین رشتے کی بات نہ مانا۔ حوالدار نے پکے ارادے کا اظہار کیا کہ وہ دشمنی ختم کرائے گا۔

اُس نے یہ کر کے بھی دکھا دیا۔ اُس نے نواب دین کے خاندان کے بزرگوں اور اپنے خاندان کے بزرگوں کو اکٹھے بٹھانے کا انتظام کر دیا۔ دونوں گاؤں کے مولویوں، ایک پیر اور دوسرے خاندانوں کے دو معزز آدمیوں کو ساتھ بٹھا کر راضی نامہ کرا دیا۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ دونوں خاندان ایک دوسرے کو رشتے دیں تاکہ دوستی پکی ہو جائے۔ دو رشتے تو اُسی وقت طے ہو گئے۔

اس کے بعد بھی ان کی آپس میں شادیاں ہوئیں۔ آپ کہیں گے کہ دشمنی ختم ہو گئی ہو گی۔ ہاں جی! پرانی دشمنی ختم ہو گئی اور تین چار سال بعد نئی دشمنی شروع ہو گئی۔ وہ اِس طرح کہ اُدھر سے ایک لڑکی روٹھ کر اِدھر آجاتی تو انتقام کے طور پر اِدھر سے دو لڑکیوں کو تنگ کر کے اُدھر اپنے اپنے میکے بھیج دیا جاتا۔ یہاں سے نئی دشمنی شروع ہوئی جو معلوم نہیں کبھی ختم ہوئی تھی یا نہیں ۔۔۔ فائدے میں علیا رہا۔ وہ علیا جو نواب دین کے گھر کا صفایا کرنا چاہتا تھا، فروزاں کا زیور اور بہت سی رقم لے کر ایسا لاپتہ ہُوا کہ آج تک اُس کا سراغ نہیں ملا کہ کہاں ہے۔

اپریل ۱۹۸۳ء کا واقعہ ہے، میں اس نواب دین کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ میرا ہم عمر ہے لیکن میں اِس عمر میں بھی سیدھا ہو کر چلتا ہوں اور نواب دین چارپائی سے اُٹھ نہیں سکتا۔

"اولاد اور اولاد کی اولاد نے کمر توڑ دی ہے"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "باہر کے پیسے نے ان میں حیا نہیں رہنے دی۔ گاؤں میں تم نے دو بڑے اُونچے

چوبارے دیکھے ہوں گے۔ وہ محل ہیں۔ وہ میرے دو بیٹوں کے ہیں۔ اُن کی ماں تین سال ہوئے مر گئی ہے۔ ہم دونوں کو اُن چوباروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ میری بیوی نے اسی مکان میں میرے ساتھ عمر گذاری ہے۔ دیکھ لو۔ یہ وہی مکان ہے جہاں تم لڑکپن میں آیا کرتے تھے۔ ویسا ہی ہے۔ بیٹوں کی یہی مہربانی بہت ہے کہ اُنہوں نے مجھے ایک نوکر دے رکھا ہے۔ وہی میرا کھانا پکاتا ہے۔ میرے پوتے بھی ہیں۔ کبھی اُن کی صورت نہیں دیکھی۔ وہ گاؤں میں ہی انگریز بن گئے ہیں۔ موٹر سائیکل لیے پھرتے ہیں۔ سنا ہے بہت لوفر ہیں۔ بس اس غم نے یہ حال کر دیا ہے۔ میرے خاندان میں دولت آئی تو حیا نکل گئی"۔

میں اُس کے پاس اس کے پوتوں کی شکایت لے کر گیا تھا لیکن شکایت نہ کی۔ میں اُس کے غم میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں بوڑھے یادوں اور باتوں میں بہت دُور پیچھے نکل گئے۔

اتفاق تھا یا معجزہ؟

میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اتنی لمبی عمر میں اپنے اور اپنے دوستوں کے اتنے زیادہ واقعات ذہن میں جمع ہیں کہ انہیں الگ الگ کرکے سنانا بعض اوقات مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسا بھی ہے کہ ایک ہی قسم کے کئی واقعات اور حادثے زندگی میں دیکھے ہیں۔ بعض اوقات یہ آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ اکثر واقعات نصف صدی سے زیادہ پُرانے ہیں۔ بعض باتیں اچانک یاد آجاتی ہیں تو خیال آتا ہے کہ یہ بھی ہُوا تھا۔

میں عمر کے اُس حصّے میں داخل ہوچکا ہوں جہاں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو کوئی اور کہانی سُنانے کے لیے اس دُنیا میں ہوں گا یا نہیں۔ آج دسواں دن ہے میں اپنے خشک ذہن کو نچوڑ رہا ہوں۔ میں کوئی واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو میرے بیٹے کے بچّے نے مجھے آکر بتایا — "دادا ابّو! رات کو ساتھ والے محلّے میں دو گھروں میں چوریاں ہوئی ہیں" — بچّے نے سنسنی خیز انداز میں مجھے دونوں چوریوں کی تفصیل سُنائی۔ راولپنڈی میں اور پاکستان کے ہر شہر میں ایک محلّے میں ایک ہی رات میں دو چوریاں ہوجانا کوئی عجیب خبر نہیں۔

بچّہ تو کہانی سنا کر اور مجھ سے داد اور پیار وصول کرکے چلا گیا لیکن میرے ذہن میں ایک چرخی چلا گیا۔ مجھے اپنے لڑکپن کے وقتوں کی چوری کی وارداتیں یاد آنے لگیں۔ ہر واردات جو مجھے یاد آئی وہ صرف واردات تھی۔ اُس میں کوئی کہانی نہیں تھی۔ آخر یادوں کے اِس سلسلے نے مجھے ایک جگہ پر روک لیا۔ یہ نقب زنی کی واردات تھی۔

یہ میری نوجوانی کے وقت کا واقعہ ہے۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً تین میل

دُور ایک اور گاؤں تھا۔ وہاں کے دو تین بزرگ ہمارے بزرگوں کے دوست تھے۔ اُس گاؤں کے بعض نوجوانوں کو ہم جانتے تھے۔ کبھی کبھی اُن میں سے کسی کے ساتھ ملاقات ہو جاتی تھی۔ اُن میں ایک کا نام سَید اکبر تھا اور سَیدا کہلاتا تھا۔ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اُس وقت اُس کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ اس کے ساتھ ہماری کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اُسے کُتّا رکھنے اور ہمارے ساتھ شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا لیکن اُس کا باپ کہتا تھا کہ جس گھر میں کُتّا ہو، اُس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔

سَیدے کی شادی ہو گئی۔ لڑکی کسی اور گاؤں کی تھی۔ شادی کے دو تین مہینے بعد سَیدے کا باپ ہمارے گاؤں میں آیا اور میرے دوست شاہباز خان کے ہاں رُکا۔ کافی دیر بعد شاہباز خان میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ مجھے اُس کے گھر بلایا گیا ہے۔ میرے والد صاحب بھی اُنہی کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں شاہباز خان کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ شاہباز خان نے مجھے تسلّی دے دی تھی کہ یہ بلاوا خیریت کا ہے ورنہ میں مشتبھوں کی طرح ڈرتا ڈرتا جاتا۔ وہاں جا کے دیکھا کہ میرے تین چار اور دوستوں کے والد صاحبان بھی بیٹھے ہُوئے تھے اور سَیدے کا باپ بھی وہاں موجود تھا۔ میرے دو تین اور نوجوان اور شکاری دوستوں کو بھی بلایا گیا تھا۔

"ایک بات سنو لڑکو"! ـــــ سَیدے کے باپ نے کہا ـــــ "سَیدے کو بھی شکار پر لے جایا کرو۔"

"چاچا جی"! ہمارے ایک دوست افضل نے کہا ـــــ "ہم نے ایک بار سَیدے سے کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ چلا کرے لیکن وہ کہتا تھا کہ ابا جی کو ڈر ہے کہ گھر میں کُتّا رکھا تو رحمت کے فرشتے یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔"

"کُتّا تو میں اب بھی اُسے نہیں رکھنے دوں گا" ـــــ سَیدے کے باپ نے کہا ـــــ "میں کہہ رہا ہوں کہ وہ شکار پر جایا کرے اور کبھی کبھی تم لوگ ہمارے گاؤں میں اُس کے پاس آجایا کرو۔"

اُس زمانے میں ماں باپ اپنے بیٹوں کو صحیح معنوں میں مرد بناتے تھے۔

مرد سے مراد یہ تھی کہ لڑکا جسم کا مضبوط اور پھُرتیلا ہو اور مشکلات کو برداشت کر سکے، لیکن ہم حیران تھے کہ سَیدا مردانگی کے معیار پر پُورا اُترتا تھا، وہ قد آور جوان تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُسے تاش کھیلنے کا چسکا پڑ گیا ہو، وہ بڑا اچھا گھوڑ سوار تھا، کبڈی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ شرمیلا اور بُزدل بھی نہیں تھا پھر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اُس کے باپ نے کہا تھا کہ ہم اُسے اپنے ساتھ لگائیں۔

دوسرے دن سَیدا ہمارے گاؤں میں آیا۔ اس سے پہلے بھی اُس کے ساتھ کبھی کبھی ملاقات رہتی تھی۔ وہ زندہ دِل نوجوان تھا۔ ہنسی مذاق کا عادی تھا۔ اُس کی شادی کو تین مہینے ہو گئے تھے۔ شادی کے بعد ہم اُسے پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ میں نے اور میرے دو تین دوستوں نے اُس کے ساتھ وہی مذاق کیے جو نئے شادی شُدہ لڑکوں کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر کچھ حیران ہُوا کہ اُس نے مذاق کا جواب مذاق سے دینے کی بجائے سر جھُکا لیا اور اگر وہ ذرا سا ہنسا بھی تو یہ زبردستی کی ہنسی تھی۔ میں اور شاہباز اُسے ساتھ لے آئے۔ میں نے اُنہیں اپنے گھر میں بٹھایا۔

صرف یہ نہیں کہ وہ خوش نہیں تھا بلکہ اُس کے چہرے پر افسوس اور مایوسی کے تاثرات تھے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ شادی کہیں اور کرنا چاہتا تھا اور ماں باپ نے کہیں اور کرا دی۔ یہی خیال ذہن میں رکھ کر میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اتنا اُداس اور پریشان کیوں ہے۔ اُس نے بظاہر بے تکلفی سے کہا کہ شادی کر کے اُس کی طبیعت بالکل بُجھ گئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ شادی کر کے میری طبیعت بھی اسی طرح بُجھ گئی تھی، لیکن تیسرے روز میری ماں نے اور میری بیوی نے ایسی آگ لگائی تھی کہ میری طبیعت پھر پہلے کی طرح دہکنے لگی۔ شاہباز خان نے بھی اُسے کہا کہ جب کسی کی آزادی غلامی میں بدل جاتی ہے تو اُس کا یہی حال ہوتا ہے۔

"نہیں بھائیو"! ـــــ سَیدے نے جواب دیا ـــــ "میں اب بھی آزاد ہوں لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میرا دل خوش کیوں نہیں رہتا۔"

"یار سیدھی بات کرو" ـــــ شاہباز نے اُسے کہا ـــــ "دِل کسی اور کو دے بیٹھے تھے اور ماں باپ گھوڑی پر بٹھا کر کسی اور جگہ لے گئے۔"

”خدا کی قسم یہ بات بھی نہیں“ ــــ سَیدے نے کہا ــــ ”اگر بات پسند کی کروں تو اس سے اچھی لڑکی شاید نہ مل سکے“۔

”پھر کیا ہے“؟ ــــ میں نے پوچھا ــــ ”وہ لڑنے جھگڑنے والی ہے“؟

”توبہ کرو جی“! ــــ سَیدے نے کہا ــــ ”اُونچی آواز نکالے تو میں اُسے وہیں چھوڑ آؤں جہاں سے آئی ہے“۔

”پھر تم نے یہ بُرا سا منہ کیوں بنایا ہُوا ہے“؟ ــــ شاہباز نے کہا ــــ ”کیا اُس نے تمہارا حُقّہ پانی بند کر دیا ہے“؟

سَیدا ہنس پڑا۔ اب بھی اُس کی ہنسی بالکل پھیکی اور مُردہ سی تھی۔ کوئی بات ضرور تھی جو اُس نے ہمیں نہ بتائی۔ ہم نے اُسے بتایا کہ ہم یاروں کے یار ہیں اور ہم اُس سے ہمدردی سے اُس کی پریشانی کی وجہ پُوچھ رہے ہیں۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ وہ ہمیں اپنے دل کی کوئی بات بتا دے گا تو وہ راز میں رہے گی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کبھی ہمارے ساتھ شکار پر چلے گا؟ اُس نے کہا کہ وہ یہی پوچھنے آیا تھا کہ ہم شکار پر کب جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ جس روز وہ جانا چاہے ہم اُس کے گاؤں آ جائیں گے۔

اُس نے دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور کہا کہ ہم کل اُس کے گاؤں آئیں۔ ہم تین لڑکے تھے ــــ میں، شاہباز خان اور افضل ــــ وہ جب جانے لگا تو ہم تینوں کچھ دُور تک اُس کے ساتھ گئے۔ جب ہم سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اُسے الگ لے جا کر بڑی سنجیدگی سے کہا کہ وہ ہم پر بھروسہ کرے۔ اگر کوئی ایسا مسئلہ اُس پہ آ پڑا ہے جو وہ اپنے گھر کسی کو نہیں بتا سکتا وہ ہمیں بتائے۔ ہو سکتا ہے ہم اُس کا کوئی ایسا مسئلہ حل کر دیں جسے وہ بڑا ہی مشکل مسئلہ سمجھتا ہے۔ میری یہ بات سُن کر وہ پہلے سے زیادہ اُداس ہو گیا۔

دوسرے دن ہم تینوں دوست اُس کے گاؤں چلے گئے۔ اُس نے ہمیں ڈیوڑھی یا بیٹھک میں بٹھانے کی بجائے اندر صحن میں بٹھایا۔ اُس کی ماں نے ہم تینوں کا استقبال بڑے پیار سے کیا۔ اُس کی بیوی بھی ہمارے سامنے آئی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ ہمارے علاقے کے دیہات میں عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ نئی دُلہنیں ذرا

شرماتی تھیں اور تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیتی تھیں۔ سَیدے کی بیوی نے یہ تکلّف بھی نہ کیا۔ اُس کے چلنے پھرنے کے انداز اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ پُھرتیلی اور کام کرنے والی لڑکی ہے۔

سَیدے کا باپ بھی ملا اور ایک دو باتیں کر کے باہر نکل گیا۔ ہم بہت دیر تک صحن میں گپیں ہانکتے رہے۔ کھانا کھا کر سَیدے نے کہا کہ آؤ باہر گھوم پھر آئیں۔ وہ ہمیں اپنے رہٹ پر لے گیا۔ وہاں ہم پھر اُس کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اُسے کیا چیز پریشان کر رہی ہے۔ اُس نے شاید پہلے ہی سوچا ہُوا تھا کہ وہ ہمیں دل کی بات بتائے گا۔

”بات کرتے ہوئے شرم آتی ہے“ ــــ اُس نے کہا ــــ ”لیکن اب یہ حالت جو میری ہو رہی ہے میری برداشت سے باہر ہے۔ معلوم نہیں میری پہلی عادتوں سے تم واقف تھے یا نہیں میں اس طرح نہیں ہُوا کرتا تھا جس طرح تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ شادی کی پہلی رات میں جب اُس کمرے میں داخل ہُوا جس میں میری دُلہن کو بٹھایا گیا تھا تو دُلہن کو دیکھتے ہی میرے دل پر خوف بیٹھ گیا۔ پھر میں صاف محسوس کرنے لگا کہ میں اندر سے کانپ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ دیکھ کر میری طبیعت اور زیادہ گھبرائی کہ میرے دونوں ہاتھ بوڑھوں کی طرح کانپ رہے ہیں۔ میرا منہ خُشک ہو گیا۔ وہ پوری رات اسی طرح کانپتے ہُوئے اور ڈرتے ہوئے گزر گئی ....

”دن کے وقت میں دُلہن کو دیکھتا رہا لیکن میری حالت بالکل صحیح رہی۔ رات کی اس حالت کا مجھ پر بہت بُرا اثر تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا تھا کہ میری دلہن معلوم نہیں کیا سوچتی ہوگی۔ دوسری رات بھی میری یہی حالت ہوئی۔ تیسری رات بھی ایسے ہی ہُوا تو میری بیوی نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں اُس سے اپنی یہ حالت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ چھپانے والی بات نہیں تھی۔ میں ڈرتا اس لیے تھا کہ دُلہن یہ کہے گی کہ اُسے ایسا خاوند ملا ہے جسے شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی۔ وہ مجھ پر جو بھی الزام لگاتی وہ اُس کا جائز حق تھا۔ میں نے تین راتوں میں اُس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں اُس کے قابل نہیں لیکن اُس نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر بڑی دلچسپی اور ہمدردی سے پوچھا کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے....

"میں نے اُسے بتایا کہ میں ہر لحاظ سے ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی نشے کی بھی عادت نہیں۔ ہر کوئی حقّہ پیتا ہے لیکن میں نے حُقّے کو بھی کبھی منہ نہیں لگایا۔ مجھے کبھی کوئی ایسی بیماری بھی نہیں ہوئی جس نے مجھ میں کوئی مستقل خرابی پیدا کر دی ہو، پھر معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے کہ اس کمرے میں آتا ہوں تو میرا جسم اندر سے بھی اور باہر سے بھی کانپنے لگ جاتا ہے....

"میری بیوی کو یہ فکر تو نہ ہُوا کہ میں معلوم نہیں کس مرض کا مریض ہوں، اُس نے کہا کہ کسی دشمن نے مجھ پر تعویذ کرا دیئے ہیں۔ بیوی کا خیال تھا کہ یہ کالے جادو کا اثر ہے۔ میری بیوی نے یہ بھی کہا کہ اُسے ایک آدمی پر شک ہے۔ میری بیوی کا رشتہ دو لڑکوں کے والدین نے مانگا تھا۔ دونوں کو جواب دے دیا گیا۔ میری بیوی کہتی ہے کہ ان لڑکوں میں ایک کا باپ شیطان سا آدمی ہے۔ وہ میرے سُسر سے اِس بات پر ناراض ہو گیا تھا کہ اُس کے بیٹے کو رشتہ نہیں دیا گیا۔ اُس نے کسی سے مجھ پر کالا جادو کرا دیا ہے"۔

"حکایت" میں کالے علم اور کالے جادو کی اتنی کہانیاں چھپ چکی ہیں کہ "حکایت" پڑھنے والوں پر کالا علم اثر نہیں کر سکتا۔ اس علم کے متعلق مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے علاقے میں یہ علم زیادہ چلا کرتا تھا۔ میں ایک فرق بتا دیتا ہوں۔ کالا علم کرنے والے عامل الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ وہ اس کا توڑ بھی کرتے ہیں۔ دوسرے پیر اور "شاہ جی" ہوتے ہیں جو پھونک مارتے اور تعویذ دیتے ہیں۔ اِن پھونکوں اور تعویذوں کا کالے علم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دراصل اِن پھونکوں اور تعویذوں کا تعلق کسی بھی علم کے ساتھ نہیں ہوتا۔

سَیدے کی بیوی کو یہ شک تھا کہ اُس شیطان فطرت آدمی نے انتقاماً سَیدے پر کچھ کرا دیا ہے۔ میں نے اِس شک کو صحیح نہ سمجھا۔ وہ آدمی انتقام لیتا تو لڑکی کے ماں باپ سے لیتا۔ سَیدے کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ سَیدے اور اُس کی بیوی نے سَیدے کی یہ حالت گھر میں کسی کو نہ بتائی لیکن سَیدا پریشان اور مایوس رہنے لگا۔ اُس کی ماں نے اُس کی بیوی سے پوچھا کہ سَیدے کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اتنا چُپ چُپ رہتا ہے؟ بیوی نے بتا دیا۔

ماں نے سیدے کے باپ کو بتایا۔ باپ نے سَیدے سے پوچھا۔ سَیدے کی رات کو جو حالت ہو جاتی تھی وہ اُس نے باپ کو بتا دی۔ اُن کے گاؤں سے چھ سات میل دُور ایک گاؤں میں ایک ہندو حکیم بہت مشہور تھا۔ اس قسم کے حکیموں کو سیانے یعنی دانشمند کہا جاتا تھا۔ سَیدے کو باپ اُس کے پاس لے گیا۔ حکیم نے سَیدے کو الگ بٹھا کر نبض دیکھی اور اُس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ حکیم نے اُسے کوئی دوائی نہ دی۔ اُس نے سَیدے کے باپ کو بتایا کہ لڑکا جسمانی لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔ اسے دوائی کی ضرورت نہیں۔

"پھر کیا ہے؟" — سَیدے کے باپ نے حکیم سے پوچھا — "اگر جسمانی نقص نہیں تو اس پر کوئی اُلٹا اثر ہے۔ کسی نے کچھ کرا دیا ہو گا"۔

"شاید یہ بھی نہیں" — حکیم نے کہا — "لڑکے نے مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ ہو سکتا ہے اس کا دل کہیں اور اٹکا ہُوا ہو"۔

باپ نے سَیدے سے پوچھا تو سَیدے نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ اُس کا دِل ہمیشہ اُس کے قابو میں رہا ہے اور اُس کے دل میں کوئی اور لڑکی نہیں۔ سَیدے کی ماں پندرہ سولہ میل دُور ایک بڑے پیر سے تعویذ لے آئی اور سَیدے کے گلے میں ڈال دیا۔ یہ ہمارے علاقے کی مشہور گدّی تھی۔ اس پیر نے کہا تھا کہ لڑکے نے کسی ایسی جگہ پیشاب کیا ہے جہاں جِنّوں کا ڈیرہ ہے۔ اسے اب جِنّ یہ سزا دے رہے ہیں۔ پیر نے کہا تھا کہ جِنّ اسے بخش دے گا لیکن کچھ وقت لگا کر ٹلے گا۔

جِنّ نہ ٹلا۔ سَیدے کا باپ بھی پیر کے پاس گیا۔ پیر نے اور تعویذ دے دیے۔ باپ نے پیر سے کہا کہ انہیں کالے جادُو کا شک ہے۔ پیر نے یقین سے کہا کہ یہ کالا جادُو ہُوا، آسیب ہُوا، کسی بھی قسم کی پکڑ ہوئی، اُس کے تعویذوں سے رفع ہو جائے گی مگر تین مہینے گزر گئے۔ سَیدے کی حالت وہی رہی۔

اُس زمانے میں ہم نے نفسیات کا کبھی نام بھی نہیں سُنا تھا۔ اب میم۔ الف صاحب کے مضمون پڑھ پڑھ کر آخری عمر میں پتہ چلا ہے کہ نفسیات بھی ایک علم ہے لیکن انسان پہلے روز سے ہی نفسیات کے علم کے زیرِ اثر رہا ہے۔ میں افضل، شہباز خان اور ہمارے دو اور دوست پیروں کو نہیں مانتے تھے۔ ہم نے پیروں

کی کرتُوت اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ شاہباز خان نے سَیدے سے کہا کہ اُس پر کوئی وہم سوار ہے۔ وہ سوچ کر بتائے کہ اُس کے ذہن میں کیا ہے۔

اُس روز بھی سَیدے نے کچھ نہ بتایا۔ اُس کی پریشانی بجا تھی کہ سَیدا جو چُست و چالاک اور پھُرتیلا تھا اور ہر طرف ہنستا کھیلتا پھرتا تھا، زیادہ تر لیٹا رہتا ہے اور باہر جاتا ہے تو چُپ چاپ رہتا ہے۔ باپ ہمارے گاؤں آتا رہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہم کُتّوں کے شکار کو جایا کرتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ بیٹے کو ایسے شغل میں لگا دے کہ وہ پہلے کی طرح خوش رہے۔ یہ سوچ کر اُس کا باپ ہمارے گاؤں آیا تھا۔

سَیدے نے اُس روز اپنے گاؤں میں ہمیں اتنا ہی بتایا۔ اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ ہم نے اُسے کہا کہ پیروں کے جال میں نہ آئے۔ وہ تو اُس نے خود بھی دیکھ لیا تھا کہ اتنے بڑے اور اتنے مشہور پیر کے تعویذوں نے ذرا سا بھی اثر نہیں دکھایا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس اُس کا علاج بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اور میرے دوستوں نے اُسے کہا کہ وہ خدا کو یاد کیا کرے۔ نماز پڑھا کرے اور مسجد کے امام سے کوئی وظیفہ پوچھ کر وہ پڑھنا شروع کر دے۔ میں نے اُسے کہا کہ خُدا کی عبادت کے سامنے کوئی جادُو اور کوئی تعویذ اثر نہیں کر سکتا۔

اُس کی بیوی حوصلے اور صبر والی لڑکی تھی۔ وہ سَیدے کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ بیوی کے اِس رَوَیے سے سیدا خوش رہنے کی بجائے اور زیادہ پریشان ہوتا تھا۔

ہم نے دو تین روز بعد شکار کا پروگرام بنا لیا اور سَیدے سے کہا کہ وہ اُس روز صبح سویرے تیار رہے، ہم اُسے گاؤں سے ساتھ لے لیں گے اور شکار کو چلیں گے۔ اس سے سَیدا کچھ خوش ہُوا۔ وہ خود محسوس کرنے لگا تھا کہ اُسے باہر نکلنا چاہیئے۔

شکار والے دن ہم سورج نکلنے سے پہلے کُتّوں کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں سے نکلے۔ سَیدے کے گاؤں سے اُسے ساتھ لیا اور اس ارادے سے چل

پڑے کہ آج دُور جائیں گے۔ ہمارا شکار کوئی شکار تو نہیں تھا۔ یہ میں نے آپ کو اپنی کئی کہانیوں میں بتایا ہے کہ ہمارا شکار اتنا سا تھا کہ گیدڑ یا خرگوش دیکھا تو اُس کے پیچھے کُتّے دوڑا دیئے اور کُتّوں کے پیچھے ہم دوڑ پڑے۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ ہمارا لہُو گرم اور ذہن ٹھنڈا رہتا تھا۔ ذہن میں ایسے خیال اور تصوّر آتے ہی نہیں تھے جو ہمارے قد ساڑھے چار فٹ سے اُوپر بڑھنے ہی نہ دیتے اور ہمیں جوانی میں ہی بوڑھا کر دیتے۔

کُتّوں کا شکار تو آج کل بھی لوگوں کو کھیلتے دیکھا ہے۔ جیپوں پر کُتّوں کو لے جاتے اور شکار کھیلتے ہیں۔ کیسٹ پلیئر اُن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہم خود ہی جیپیں اور خود ہی گھوڑے ہُوا کرتے تھے۔ اسی مشقّت اور بھاگ دوڑ اور ذہن کو اپنے قابو میں رکھنے کا کرشمہ ہے کہ عمر کے آخری حصّے میں پہنچ کر بھی جسم بیماریوں سے محفوظ ہے اور ٹانگوں میں اتنی پھُرتی ہے کہ راولپنڈی کی کسی سڑک پر چلتے جب کوئی چھچھورا چھوکرا موٹر سائیکل کے کرتب دکھاتا، تیز رفتار سے قریب سے گزرتا ہے تو میں اُچھل کر فوراً ایک طرف ہو جاتا ہوں۔

سَیدے کو ہم ساتھ لے گئے۔ ہمارے ساتھی آگے آگے جا رہے تھے میں نے سَیدے کو پیچھے اپنے ساتھ کر لیا۔ شاہباز خان بھی ساتھ تھا۔ ہم اُس کے ساتھ اُس کے مسئلے کے متعلق باتیں کرنا اور سُننا چاہتے تھے۔ ہم سب کو خوش باش اور بھاگتا دوڑتا دیکھ کر وہ اور زیادہ اُداس ہو گیا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کے قدم رُکنے لگے۔

”تمہیں ایک اور بات بتاؤں؟“ — اُس نے کہا — ”لیکن تم ہنسو گے۔“

ہم پر اُسے اعتبار تھا، پھر بھی بات کرنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کے دل اور دماغ میں جو بات اور جو خیال اٹکا ہُوا ہے وہ باہر نکال دے۔ اُس نے ایک بات دل سے نکال کر ہمارے آگے رکھ دی۔ یہ میں آپ کو اپنے لفظوں میں سناتا ہوں۔ سَیدے کی عمر چار سال سے ذرا کم یا زیادہ تھی۔ اُس کے باپ اور ماں میں لڑائی جھگڑا ہو گیا۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ سَیدے کے باپ نے اُس کی ماں کو دو تین مرتبہ دو چار تھپڑ بھی مارے تھے۔ سَیدے کو ماں سے جو پیار تھا، وہ ہر بچّے کو ہوتا ہے۔ اُسے باپ پر غصّہ آتا تھا لیکن وہ باپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

چار سال کی عمر میں اُس کے ماں باپ میں پھر معرکہ ہوگیا تو ماں رُوٹھ کر اپنے میکے گاؤں چلی گئی۔ سَیدے کے باپ نے اُس پر اور سَیدے پر یہ ظلم کیا کہ سَیدے کی ماں کو بچّہ ساتھ نہ لے جانے دیا۔ اُس نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اُسے منانے اور گھر لانے نہیں آئے گا۔ چار سال عمر کا سَیدا ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ اُس کے ساتھ بہت پیار کرتا تھا۔ سَیدے کا بڑا بھائی تھا، وہ بھی سَیدے کو اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن سَیدا ماں کے لیے روتا تھا۔

اُس کا باپ امیر زمیندار تھا۔ اُس نے ایک مزارعہ کی نوجوان بیٹی کو اپنے گھر ہانڈی روٹی اور سَیدے کے لیے رکھ لیا۔ اس لڑکی کی عمر سترّہ اٹھارہ سال تھی اور شکل صورت کی اچھی تھی۔ وہ سَیدے کے ساتھ پیار بھی کرتی اور اُس کے ساتھ کھیلتی بھی تھی۔ سَیدے کو باپ اپنے پاس سُلاتا تھا۔ سَیدے کو یہ لڑکی ماں کی طرح اچھی لگنے لگی۔

سَیدے کے بھائی کی عمر بیس اکیس سال تھی اور اُس کی منگنی ہو چکی تھی۔ ایک روز سَیدے کا باپ گھر نہیں تھا۔ اُس کا بھائی گھر تھا۔ نوکرانی سَیدے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ سَیدے کے بھائی نے نوکرانی کو بلایا اور اُسے بھوسے والے کمرے میں لے گیا پھر اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ دو تین منٹ بعد سَیدے کو اُس کمرے میں سے نوکرانی کے رونے کی اور غصّے سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ سَیدا گیا۔ وہ تو بچّہ تھا۔ اُس نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔

دیہات کے کواڑ برائے نام ہوتے تھے۔ ان میں کُھلی درزیں ہوتی تھیں۔ سَیدے نے درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا۔ اُس کا بھائی نوکرانی کے ساتھ دھینگا مُشتی کر رہا تھا اور نوکرانی اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جن کا دیا کھاتی تھی اُن کے تنومند بیٹے سے بچ نہ سکی، پھر سَیدے کے بھائی نے اُسے چاقو دکھا کر کہا کہ اُس نے زبان کھولی تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔

لڑکی زبان بند نہ رکھ سکی۔ سَیدے کا باپ گھر آیا تو نوکرانی نے رو رو کر اُسے بتایا۔ باپ نے سَیدے کے بھائی کو مُکّوں اور ٹُھڈوں سے پیٹنا شروع کیا تو یہی نظر آتا تھا

کہ وہ اپنے بیٹے کو جان سے مار کر دم لے گا۔ سَیدے کا بھائی شاید بیہوش ہو گیا تھا۔ باپ گرج گرج کر یہی کہتا تھا — "مر جا حرام کی اولاد! تُو میرے گھر پیدا کیوں ہُوا تھا"۔ پھر باپ نے نوکرانی کو گلے لگایا اور بہت دیر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا تھا۔

سَیدے کو بڑے ہو کر ماں نے بتایا تھا کہ اس لڑکی کی شادی کا آدھا خرچ جس میں جہیز کی کچھ چیزیں بھی شامل تھیں، سَیدے کے باپ نے دیا تھا۔ اس کے بعد سَیدے کے بڑے بھائی کے ساتھ اُس کے باپ نے کبھی پیار اور محبت کی بات نہیں کی تھی۔ اُس کی شادی کر کے اُسے الگ مکان بنوا دیا تھا۔ کہتا تھا کہ تم عزّت اور غیرت والوں کی حویلی میں رہنے کے قابل نہیں۔

سَیدا بہت چھوٹا تھا۔ اُس کے دل پر دہشت بیٹھ گئی۔ ایک عورت اُس کی ماں تھی اور ایک عورت نوکرانی تھی۔ سَیدا دونوں کو پاک اور مقدس سمجھتا اور اُس کے ذہن پر یہ نقش ہو گیا کہ عورت پاک اور مقدّس ہوتی ہے اور عورت کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی گناہ ہے۔

سَیدے کی ماں تین چار مہینے اپنے میکے بیٹھی رہی۔ اُس کے بڑے بیٹے کی شادی کا دن مقرر ہُوا تو باپ ان کی ماں کو راضی کر کے لے آیا تھا۔ نوکرانی شادی تک اسی گھر میں رہی۔ سَیدے نے نوکرانی کو ماں کا درجہ دیا ہُوا تھا۔

"اِس نوکرانی کی شادی کسی اور گاؤں میں ہوئی تھی" — سَیدے نے ہمیں سُنایا — "وہ چلی گئی تو میں رو پڑا تھا۔ وہ جب سسرال سے آتی تھی تو ہمارے گھر ضرور آتی اور میں دن کا زیادہ وقت اُسی کے گھر گزارتا تھا .... اب بھی وہ میرے ساتھ اُسی طرح پیار کرتی ہے .... پھر میری شادی ہو گئی اور جب میں دُلہن کے کمرے میں گیا تو پہلے اپنی ماں کا خیال آیا پھر نوکرانی میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا جسم کانپنے لگا پھر ہر رات میرے ساتھ یہی ہوتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ مجھ پر کوئی وہم سوار ہو گیا ہے"۔

اگر آپ کو میری ان باتوں میں کچھ عقل نظر آتی ہو تو یہ میری عمر کی وجہ سے ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے اور جب سَیدے نے ہمیں یہ بات سُنائی تھی اُس وقت ہم نفسیات کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ سچّی بات

یہ ہے کہ میں اب بھی نفسیاتی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس اتنا علم نہیں ہے۔ اگر یہ کہانی پڑھنے والوں کی سمجھ میں کچھ آئے تو وہ خود ہی سمجھ لیں۔ میں یہی کہتا ہوں کہ یہ کوئی نفسیاتی معاملہ تھا۔

یہی باتیں کرتے کرتے ہم اتنی دُور پہنچ گئے جہاں ہمیں جانا تھا۔ یہ وہی پہاڑی خطّہ ہے جو راولپنڈی کی طرف جاتے ہوئے جہلم سے آگے آتا ہے۔ اس خطّے کے متعلق میں اپنی کہانیوں میں بڑی تفصیل سے آپ کو بتا چکا ہُوں۔ اب تو اُس علاقے میں گیدڑ بھی شاید کم ہی نظر آتے ہوں گے، میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت وہاں بھیڑئیے بھی تھے۔ اُس روز ہماری بڑی خواہش تھی کہ کوئی بھیڑیا نظر آئے تو کُتّے اُس کے پیچھے چھوڑے جائیں۔

ہم جب اُس ڈراؤنے اور خطرناک علاقے میں داخل ہوئے تو میں نے سَیدے سے کہا کہ یار، آج ایک دو بھیڑئیے مِل جائیں تو پھر نہیں پتہ چلے گا کہ شکار کیا ہوتا ہے۔ گیدڑوں اور خرگوشوں کو مار لینا تو بہت ہی آسان ہے۔ بھیڑئیے کا نام سُن کر وہی سَیدا جو مرا مرا سا نظر آتا تھا یکلخت چمک اُٹھا۔ کہنے لگا کہ آج پھر بھیڑئیے کا ہی شکار ہو جائے۔

اُس زمانے میں وہ علاقہ جنگل ہوتا تھا۔ کھڈ بھی تھے اور اُونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں۔ اب تو لوگوں نے درخت کاٹ کاٹ کر اُن پہاڑیوں کو ننگا کر دیا ہے۔ ہم اس طرح جا رہے تھے کہ کبھی تو بلندی پر جا رہے ہوتے اور کبھی بہت ہی نیچے چلے جاتے۔ درختوں اور چٹانوں میں سے جب تیز ہوا گزرتی تھی تو بڑی ڈراؤنی آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ بعض جگہ تو اس طرح آواز آتی تھی جیسے کوئی عورت رو رہی ہو۔ جو لوگ ان آوازوں سے واقف نہیں وہ یقیناً ڈر جاتے ہوں گے۔ ہم ایک ذرا اُونچی جگہ جا رہے تھے۔ ہمارے دو تین ساتھیوں کے پاس غلیلیں تھیں۔ تھوڑی دُور درخت پر چیلیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہمارے ایک دوست نے چیل کو غلیل سے پتھر مارا۔ اتنی دُور سے غلیل سے پھینکا ہُوا چھوٹا سا پتھر چیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے پتھر چیل کے سَر پر لگا ہو۔ چیل اُڑی لیکن ہوا میں پھڑ پھڑا کر تھوڑی دُور آگے گہرے علاقے میں گری۔ ہم جہاں

کھڑے تھے وہاں سے وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی۔

یہ تو ہمارے لیے معمولی سا تماشہ تھا۔ ہم سب نے اپنے اُس ساتھی کو اتنے اچھے نشانے کی داد دی لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تماشہ تو اب شروع ہوگا۔ یہ اس طرح ہُوا کہ چیل گری اور اس کے ساتھ ہی ہمیں کُتّوں کے بھونکنے اور غرّانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے دو تین ساتھیوں نے کان کھڑے کر کے کہا کہ یہ کُتّے ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ بھیڑئیے معلوم ہوتے ہیں۔ ہم تیز نہیں دوڑ سکتے تھے کیونکہ درخت بھی تھے اور زمین بہت اونچی نیچی اور پتھریلی تھی۔ یہ زیادہ تر پھلاہی کے درخت تھے جو اُونچے نہیں ہوتے۔ ان کی ڈالیاں زمین سے ذرا ہی اُوپر ہوتی ہیں اور اس درخت کے کانٹے ٹیڑھے اور بڑے تیز ہوتے ہیں۔ ان درختوں میں سے تیزی سے گزر کر جانا ممکن نہیں تھا۔ ہم جُوں جُوں آگے بڑھتے جاتے تھے، یقین ہوتا جاتا تھا کہ یہ بھیڑیوں کی ہی آوازیں ہیں۔

کچھ اور آگے گئے تو یہ بلندی یکلخت نیچے چلی گئی۔ اُدھر سے اس کی شکل پہاڑی جیسی تھی۔ نیچے کچھ جگہ ہموار سی تھی۔ اس میں درخت بھی تھے اور اس کے اِرد گرد نوکیلی چٹانیں تھیں۔ وہاں ہمیں یہ تماشہ نظر آیا کہ جس چیل کو ہمارے ایک دوست نے گرایا تھا وہ آگے آگے بھاگ رہی تھی اور تین بھیڑئیے اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چیل کے پنجے خاصے تیز ہوتے ہیں اور اُس کی چونچ بھی بڑی سخت ہوتی ہے۔ یہ گوشت کھانے والا پرندہ ہے۔ جو بھیڑیا اس کے قریب جاتا تھا چیل پَر پھیلا کر زمین سے ذرا اُٹھتی اور اُس کے منہ پر پنجے مارتی تھی۔ وہ بھیڑیا پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھیڑیوں نے چیل کے پَر توڑ دیئے ہیں یا یہ وجہ تھی کہ غلیل کا پتھر اُس کے پَر کی جڑ میں لگا ہوگا اس لیے وہ اُڑنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بھیڑئیے اُسے یوں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے وہ اُس کے ساتھ کھیل رہے ہوں۔

ہم نے کُتّوں کی زنجیریں ابھی کھولی نہیں تھیں۔ انہوں نے بھیڑیوں کو دیکھا تو وہ زنجیریں تڑانے لگے۔ ہم نے کُتّے چھوڑ دیئے۔ بھیڑئیے چونکہ اپنے شکار کو پکڑ رہے تھے اس لیے وہ بھاگنے کی بجائے مقابلے پر اُتر آئے۔ اُس

روز ہمارے ساتھ صرف سات کُتّے تھے۔ ہم خود نیچے نہ گئے۔ اُوپر کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ ہمارے کُتّوں نے بھیڑیوں کو گھیرے میں لے لیا، لیکن بھیڑیئے مقابلے کے لیے پُوری طرح تیار تھے۔ ہم نے دیکھا کہ معلوم نہیں کہاں سے ایک اور بھیڑیا نکل آیا۔

یہ ہم نے بہت بعد میں سُنا تھا کہ بھیڑیئے خواہ کتنے ہی ہوں وہ اپنی تعداد سے کم تعداد کے کُتّوں کا بھی مقابلہ نہیں کیا کرتے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں وجہ معلوم ہو گئی کہ یہ بھیڑیئے کیوں اتنے زیادہ کُتّوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے ہیں۔ دائیں طرف ایک چٹان تھی جو درمیان سے ذرا پھٹی ہوئی تھی۔ وہاں جھاڑیاں خاصی گھنی تھیں۔ وہاں سے بھیڑیوں کے دو بچّے باہر آئے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ بھیڑیئے یہیں کے رہنے والے ہیں اور یہاں اُن کے بچّے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کمزور اور ڈرپوک سی کُتیا جب بچّے دیتی ہے تو وہ ہر کسی پر جو بچّوں کے قریب سے گزرے، حملہ کر دیتی ہے۔ بھیڑیوں کی خونخواری اور دلیری کی وجہ بھی یہی ہو سکتی تھی کہ وہاں اُن کے بچے تھے۔ چوتھا بھیڑیا جو بعد میں آیا تھا وہ اُسی جگہ سے نکلا ہو گا جہاں سے بچّے باہر آئے تھے۔ یہ بھیڑیوں کی غلطی تھی کہ وہ چار کی تعداد میں تھے اور سات شکاری کُتّوں کے مقابلے میں جم گئے تھے۔

اُن کے درمیان بڑی خونریز لڑائی ہوئی۔ ہمارے ایک دوست کے سفید بُل ٹیریر کُتّے کا رنگ بالکل لال ہو گیا۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ کوئی کُتّا مارا جائے گا۔ لڑائی اتنی خطرناک تھی کہ ہم سب ڈر گئے کہ ان کے قریب گئے تو ہم میں سے کوئی مارا جائے گا۔ خود اپنے کتوں سے ہمیں خطرہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ایسا منظر تھا جو فلمانے کے قابل تھا۔ ایسے سین تو آپ نے کبھی انگریزی فلموں میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ چیل کا پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔

وہاں درخت زیادہ تھے۔ کُتّے اور بھیڑیئے لڑتے لڑتے بکھرنے لگے۔ اُوپر سے ہمیں اپنے بعض کُتّے نظر نہیں آتے تھے۔ وہاں اب حالت یہ تھی کہ کبھی دو کُتّے ایک بھیڑیئے سے لڑ رہے ہوتے کبھی دو بھیڑیئے ایک کُتّے کو گھیر لیتے۔ ہم اس وجہ سے نیچے اُترنے لگے کہ کوئی کُتّا خطرے میں ہو تو اُسے بچا لیں۔

نیچے اُترتے تک معرکے کی صورت یہ ہو چکی تھی کہ ایک بھیڑیا بھاگ نکلا تھا اور شاید تین کُتّے اُس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ بھیڑیوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہم ایک دو نہیں دس گیارہ لڑکے تھے۔ ہم سب نے اپنے کتّوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا۔ بھیڑیوں کو تو بھاگنا ہی تھا۔ پھر میدانِ جنگ کے حالات یہ ہو گئے کہ ایک یا دو بھیڑیئے اُن جھاڑیوں میں غائب ہو گئے جہاں سے اِن کے دو بچّے باہر آئے تھے۔ دو کُتّے اِن جھاڑیوں کے اندر جاتے اور واپس آ جاتے تھے۔ یہ بھیڑیوں کی کچھار تھی جس کا دہانہ جھاڑیوں کے پیچھے چھُپا ہُوا تھا۔ پیچھے چٹان تھی۔ دہانہ ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بھیڑیئے دہانے کے اندر ہوں گے اور اندر سے کُتّوں کے منہ پر پنجے مارتے ہوں گے۔

دو تین اور کُتّے جو کسی اور بھیڑیئے کے پیچھے چلے گئے تھے، وہ بھی آ گئے اور جھاڑیوں پر بار بار حملے کرنے لگے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اندر ایک بھیڑیا ہے یا دو ہیں۔ افضل اور ہمارے ایک اور دوست موٹر نے دائیں بائیں سے ذرا اُوپر جا کے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ کُتّوں کو پکڑ لو۔ وہ کہتے تھے کہ کچھار کا منہ اتنا تنگ ہے کہ بھیڑیا یا کُتّا بیٹھ کر اندر جا سکتا ہے۔ اندر سے یہ کچھار کھُلے غار کی طرح ہو گی۔ خطرہ یہ تھا کہ کوئی کُتّا اندر چلا بھی گیا تو اُسے باہر نہیں نکالا جا سکے گا۔ بھیڑیئے تو اندر باہر آنے جانے کے عادی تھے۔ مشکل کُتّوں کے لیے تھی۔

ہم نے کُتّوں کو پکڑ پکڑ کر پیچھے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ وہ ہمارے قابو میں آتے ہی نہیں تھے۔ تین کُتّے زخمی تھے۔ ہم نے بڑی ہی مشکل سے کُتّوں کو پیچھے کیا اور انہیں زنجیریں ڈالیں۔ تب ہم نے دیکھا کہ ایک کُتّا کم ہے اور سَید ابھی کہیں نظر نہیں آ رہا۔ ہمارے کُتّے بھونک اور غرّا رہے تھے اس لیے اور کوئی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ سَید سے کا ہم سب کو اس لیے فکر ہُوا کہ وہ پہلی بار ہمارے ساتھ آیا تھا اور وہ ذہنی لحاظ سے ٹھیک نہیں تھا۔ وہاں سانپوں کا بھی خطرہ تھا۔ بھیڑیوں کا خطرہ تو تھا ہی۔ ہمیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ کچھار میں کتنے بھیڑیئے گئے ہیں اور کتنے باہر ہیں۔

ہم اُونچی نیچی چٹانوں اور ٹیکریوں میں گھرے ہُوئے تھے۔ درخت بھی

زیادہ تھے اس لیے تھوڑی دُور تک بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہم سب بکھر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ فوراً ہی ہم میں سے کسی نے بلند آواز سے کہا ـــ "اِدھر ہے اوئے" ـــ میں قریب ہی تھا۔ اُدھر کو دوڑا۔ میرے سامنے دو اُونچی ٹیکریاں تھیں جن کے درمیان ذرا کشادہ گلی سی تھی۔ یہ آگے سے بند تھی۔ ہمارا گمشدہ کُتّا بھی وہیں تھا اور سَیدا بھی، لیکن دو بھیڑیوں نے انہیں بڑے سخت اور خطرناک معرکے میں اُلجھایا ہوا تھا۔ وہ ہمارے ایک دوست کا کُتّا تھا جو شکار کے لیے اتنا بُرا نہیں تھا، دوسرے کُتّوں کا ساتھ بڑی جانفشانی سے دیتا تھا لیکن اکیلا اتنا طاقتور اور لڑاکا نہیں تھا۔ دو بھیڑیوں کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر سَیدا اُس کے ساتھ نہ ہوتا تو دو بھیڑئیے اُسے چیر پھاڑ چکے ہوتے۔ وہ ذرا ذرا سا زخمی معلوم ہوتا تھا لیکن بھاگ نہیں رہا تھا۔

ہم جب وہاں پہنچے اُس وقت ایک بھیڑئیے نے اُوپر سے کُتّے کی گردن پکڑی ہوئی تھی اور دوسرا اُسے کہیں منہ ڈالنے کے لیے اُس کے اِرد گرد گھُوم رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے تک سَیدے نے دوسرے بھیڑئیے کو دُم سے پکڑا۔ بھیڑیا بہت تیزی سے پیچھے مُڑا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ بھیڑیا کُتّا نہیں ہوتا درندہ ہوتا ہے۔ خدا نے اُس کے پنجے اور دانت چیرنے پھاڑنے کے لیے بنائے ہیں اور بھیڑیا بڑا پھُرتیلا درندہ ہے۔ اگر سَیدا اُسے کُتّے کی قسم کا جانور سمجھ رہا تھا تو یہ اُس کی غلطی تھی۔

ہم تو سمجھے کہ سَیدا گیا لیکن سَیدا بھیڑئیے سے زیادہ تیز نکلا۔ اُس نے بھیڑئیے کو پیچھے گھسیٹا، خود بھی پیچھے ہٹا اور زور سے گھوما پھر گھومتا ہی رہا۔ بھیڑیا زمین سے اُٹھا۔ سَیدے نے اُسے چار پانچ چکر دیئے جس طرح آپ نے اولمپکس میں کھلاڑیوں کو زنجیر والا گولہ پھینکتے دیکھا ہوگا۔ بھیڑیا چیخنے لگا۔ سَیدے نے اُسے گھما گھما کر زور سے چھوڑا۔ بھیڑیا دس بارہ گز دُور ایک درخت کے تنے سے جا لگا اور گرا۔ وہ بڑی تیزی سے اُٹھا۔ اُسے چکر آئے تھے اور اُسے چوٹ بھی لگی تھی۔ وہ بھاگنے لگا لیکن اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس طرف جائے۔ وہ ہماری طرف دوڑا لیکن لڑکھڑا رہا تھا۔ ہم نے کُتّے چھوڑ دیئے۔

دوسرے بھیڑئیے نے کُتّے کی گردن منہ میں لی ہوئی تھی۔ اُس نے بھیڑئیے

کی پہلی چیخوں سے ہی ڈر کر کُتّے کی گردن چھوڑ دی، ہماری طرف دیکھا اور ہوا کی رفتار سے ساتھ والی ٹیکری پر چڑھ کر دوسری طرف غائب ہو گیا۔ دوسرا بھیڑیا ہمارے کُتّوں کے نرغے میں آگیا تھا۔ اُس کی بدقسمتی، سب سے آگے افضل کا بُوہلی تھا۔ بُوہلی نے اپنا مخصوص داؤ استعمال کیا۔ اُس نے بھیڑئیے کی گردن اُوپر سے منہ میں لے لی اور زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ باقی کتّوں میں سے کسی نے اُس کی ایک ٹانگ پکڑی، کسی نے دوسری، جس کا جہاں منہ پڑا، اُس نے دانت گاڑ دیئے اور دو منٹ میں اُنہوں نے بھیڑئیے کا پوسٹمارٹم کر دیا۔

میں اور شاہباز دوڑ کر سَیدے تک پہنچے۔ اُس کی قمیض کی ایک آستین کندھے سے کلائی تک پھٹی ہوئی تھی اور اُس کے بازو پر بھیڑئیے کے پنجے کی خراشیں تھیں جن سے خُون نکل رہا تھا۔ ایک لڑکے نے اپنی پگڑی پھاڑ کر خراشیں صاف کیں اور خدا کا شُکر ادا کیا کہ یہ صرف خراشیں تھیں، زخم کھال سے نیچے تک نہیں گئے تھے۔ اُس کے بازو پر ہم نے پگڑی لپیٹ دی۔ سَیدے نے بتایا کہ اُس نے اس کُتّے کو اِدھر آتے دیکھ لیا تھا۔ دو بھیڑئیے اس کے پیچھے آئے۔ سَیدا اِس کُتّے کو بھیڑیوں سے بچانے کے لیے ان کے پیچھے گیا تھا۔ ایک بھیڑئیے نے سَیدے پر حملہ کیا تھا۔ سَیدے نے بھاگنے کی بجائے اُس کا مقابلہ اس طرح کیا کہ بھیڑئیے نے اُسے پنجے مارنے کے لیے اگلی ٹانگیں اُٹھائیں تو سَیدے نے فٹ بال کو کِک مارنے کی طرح بھیڑئیے کے پیٹ میں کِک ماری۔ بھیڑیا پیچھے تو ہٹا لیکن اُس کے بازو پر پنجہ مار گیا۔ سَیدا خالی ہاتھ تھا۔ اُس نے ایک پتھر اُٹھا لیا اور بھیڑئیے کو مارا جو بھیڑئیے کو ذرا نیچ کر لگا۔

اگر سَیدا بھیڑئیے کے آگے بھاگ اُٹھتا تو اُس کا خُدا ہی حافظ تھا۔ اُس نے بڑی دلیری سے بھیڑئیے کا مقابلہ کیا، پھر دونوں بھیڑئیے کُتّے پر ٹوٹ پڑے۔ ہمارے علاقے میں آج بھی بھگیاڑ (بھیڑیا) خوفناک درندہ سمجھا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں بھی اسے خوفناک سمجھتے تھے لیکن بھیڑئیے بہت کم تھے۔ کبھی رات کو دُور سے بھیڑئیے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میں جب پہاڑی

اور جنگلاتی علاقے کا واقعہ سُنا رہا ہوں، وہاں اُس دَور میں بہت بھیڑئیے ہوتے تھے اور وہاں انہیں شکار بھی بہت مل جاتا تھا۔ اب تو وہاں بھی گاؤں آباد ہو گئے ہیں اور پکّی سڑکیں بن گئی ہیں اور بھیڑئیے غائب ہو گئے ہیں۔

بھیڑئیے کے متعلق آپ کو ایک اور بات بتا دوں جو میں نے بہت عرصہ بعد کتابوں میں پڑھی تھی۔ جن علاقوں میں بھیڑئیے ہوتے ہیں وہاں وہ گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں۔ اکیلا بھیڑیا انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ اگر گروہ ہو تو پھر یہ انسان کو یا کسی بھی جانور کو اپنا شکار سمجھتے ہیں۔ اُس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ وہ گروہ صرف چار بھیڑیوں کا تھا۔ اگر دس بارہ کا ہوتا تو ہمارے کُتوں کا اور ہمارا انجام کچھ اور ہوتا۔

سَیدا بہت خوش تھا۔ کہتا تھا کہ آئندہ بھی اِدھر ہی آیا کریں گے میرے ایک دوست نے اُسے کہا کہ گھر جا کر یہ نہ بتانا کہ ہم بھیڑیوں کے شکار کو گئے تھے اور یہ بھی نہ بتانا کہ یہ بھیڑئیے نے پنجہ مارا ہے۔ کہنا یہ کُتّے کا پنجہ لگا ہے۔ اگر بتا دو گے تو ہماری ماؤں کو بھی پتہ چل جائے گا پھر کُتّوں کے ساتھ ہمارا گاؤں سے باہر نکلنا بند کر دیا جائے گا۔

میں نے بتایا ہے نا کہ بھیڑئیے کو بہت خوفناک درندہ سمجھا جاتا تھا۔ مائیں اپنے بچوں کو بھگیاڑ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں اور اپنے شیطان بیٹوں کو گالی بھی یہی دیا کرتی تھیں — "تجھے بھگیاڑ کھا جائیں .... تیرا کلیجہ بھگیاڑوں کے آگے ڈالوں گی" — لیکن کوئی ماں نہیں چاہتی تھی کہ بھگیاڑ کی آواز بھی اُس کے بیٹے تک پہنچے۔

پھر ہُوا بھی ایسے ہی کہ اپنے بیٹوں کے کلیجے بھیڑیوں کے آگے پھینکنے والی ماؤں کو پتہ چل گیا کہ پچھلی بار وہ کُتّوں کو ساتھ لے گئے تھے تو بھیڑیوں کے ساتھ جا لڑائی جھگڑا کیا تھا۔ ماؤں کو یہ خبر پانچ چھ روز بعد سَیدے کے گاؤں سے ملی تھی۔ دس بارہ مائیں ایک دوسری کے گھر کود دوڑ پڑیں۔ ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے — "ہیں ری! وہ تیرا بھی گیا تھا بھگیاڑوں کے شکار پر؟ میرا شیطان بھی گیا تھا" — ماؤں کی کانفرنس منعقد ہوئی اور ہمارے خلاف بڑی زوردار قراردادیں پاس ہوئیں۔ پھر ماؤں نے ہمیں جو بےتُکی سنائیں

وہ ہم نے بڑے شریف اور برخوردار بچّوں کی طرح سر جھکا کر سُن لیں۔ میری ماں نے میرا ایک کان پکڑا اور کھینچ کر اپنے پاؤں میں بٹھا لیا۔ کہنے لگی کہ کھا قسم، تُو آئندہ اُدھر نہیں جائے گا جدھر بھگیاڑ ہوتے ہیں۔ میں نے اُسی قسم کی قسم کھائی جس طرح ہمارے وزیر وزارت سنبھالنے سے پہلے حلف اُٹھایا کرتے ہیں۔

اس ایک واقعہ سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سَیدا کتنا دلیر اور مضبوط دل کا نوجوان تھا۔ اس سَیدے کو کون بُزدل اور ڈرپوک کہہ سکتا تھا۔ ہم چار پانچ دنوں بعد اُسے دیکھنے گئے کہ اُس کے زخم ٹھیک ہُوئے ہیں یا نہیں۔ وہ اب بالکل ٹھیک تھا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ اُسے بھی گھر سے جُوتے پڑے تھے یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ ماں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور ماں نے غریبوں کو پیسے اور روٹی اور مجھے گالیاں دی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے باپ نے اُس کی خُوب حوصلہ افزائی کی تھی اور کہا تھا کہ تم اصل مرد ہو۔

ہم نے اُس سے پوچھا کہ اب بھی رات کو اُس پر وہی اثر ہوتا ہے یا ختم ہو گیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ اثر پہلے کی طرح موجود ہے۔ پھر ہم اسی معاملے پر بات کرتے رہے۔ اُس نے بتایا کہ یہاں سے ڈیڑھ دو میل دُور چھوٹا سا جو گاؤں ہے وہاں تین چار مہینوں سے کوئی نیا شاہ آیا ہُوا ہے اور آتے ہی وہ مشہور ہو گیا ہے۔

"میری ماں کہتی ہے کہ تم اُس کے پاس جاؤ" — سَیدے نے کہا — "بیوی بھی یہی کہتی ہے۔ میرے ابّا کا بھی یہی ارادہ ہے، لیکن تم کہتے ہو کہ ان پیروں اور شاہوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے اتنے بڑے پیر کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ رَتی بھر فائدہ نہیں ہُوا۔"

"میں تمہیں پھر یہی کہوں گا" — میں نے کہا — "جو مانگنا ہے اپنے اللہ سے مانگو۔"

"ہاں یار!" — شاہباز خان نے کہا — "ہم نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو۔"

ہم اُسے پکّا کر کے واپس آ گئے۔

تقریباً ایک مہینہ بعد سَیدا ہمیں ملنے ہمارے گاؤں آیا۔ میں نے سب سے پہلے اُس میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ اُداس اور مایوس نہیں تھا بلکہ ہنستا مُسکراتا آیا اور جب مجھ سے بغلگیر ہُوا تو ایسے پتہ چلتا تھا کہ وہ میری پسلیاں توڑ دے گا۔

"کیوں سَیدے!" — میں نے اُس کے کان میں کہا "معلوم ہوتا ہے کوئی تعویذ اثر کر گیا ہے"۔

"ہاں ہاں" — سیدے نے میری پیٹھ پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر کہا — "یہ تمہارے تعویذ کا اثر ہے"۔

اُس نے جو واقعہ سنایا وہ اُس وقت میرے لیے بڑا عجیب تھا۔ آج میں اسے عجیب نہیں سمجھتا۔ میں یہ واقعہ اُسی کے الفاظ میں سُناتا ہُوں۔

"میرے والدین میرے پیچھے ہی پڑ گئے کہ میں اُس شاہ کے پاس ضرور جاؤں" — سَیدے نے کہا۔ "بیوی نے بھی یہی زور دیا۔ میں نے انکار تو کیا لیکن مجھے دیکھ دیکھ کر یہ تینوں بہت پریشان رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا، میں کم از کم ان تینوں کو خوش کرنے کے لیے ان کا کہا مان لوں۔ ایک روز میں اکیلا ہی وہاں چلا گیا۔ شاہ کو دیکھا تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص پہنچ والا پیر فقیر نہیں ہو سکتا۔ وہ تو لال سُرخ پہلوان لگتا ہے۔ اُس کی آنکھیں اس طرح چڑھی ہوئی تھیں جیسے نشے میں ہو۔ اُس کے سامنے تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس شخص کے پاؤں کو ہاتھ لگاؤں اور سلام کروں۔ میں نے ایسے ہی کیا۔ شاہ نے نشیلی سی آواز میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ مجھ پر کیا گزُر رہی ہے....

"اُس نے اُسی طرح جھومتی ہوئی آواز میں بڑے رُعب سے کہا — 'تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہو رہا۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اُس بچاری لڑکی پر ہو رہا ہے۔ اُسے ساتھ لاؤ۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ یہ کسی نے کچھ کیا ہُوا ہے یا کوئی جِنّ وغیرہ ہے' — اُس نے ایسی باتیں کیں کہ میں کسی حد تک مان گیا کہ اپنی بیوی کو ساتھ

لانا چاہیئے....

"میں دوسرے ہی دن اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں گیا۔ وہ اُسی طرح فرش پر دری بچھا کر بڑے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا جھوم رہا تھا اور تین چار آدمی اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ میری بیوی کو اُس نے اپنے سامنے بٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میری بیوی کا چہرہ پکڑ کر اپنے قریب کیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ مجھے اُس کی یہی حرکت بہت بُری لگی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اور اُس کا جو رُتبہ بھی تھا وہ میری بیوی کے لیے غیر مرد تھا....

"اُس نے میری بیوی کو پیچھے ہٹا کر اور آنکھیں بند کر کے کہا — 'یہ وہی کافر ہے' — میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ کون سا کافر ہے۔ اُس نے کہا — 'تم اُسے نہیں جانتے۔ یہ ایک جِنّ ہے جو مسلمان نہیں اور وہ حضرت سلیمانؑ کو بھی نہیں مانتا۔ جہاں کہیں کوئی خوبصورت لڑکی دیکھتا ہے اُس کے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں مجھے وہ صاف نظر آ رہا ہے۔ جب تم اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہو تو یہ کافر جِنّ تمہیں ڈرا دیتا ہے' — یہ کہہ کر اُس نے ساتھ والے دروازے کی طرف اشارہ کر کے میری بیوی سے کہا — 'ذرا اندر چل کاکی! میں اس سے پوچھتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے۔ اگر نہ مانا تو میں اس کے سارے خاندان کو جلا دوں گا'....

"وہ اُٹھا اور میری بیوی کو بازو سے پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ میں کیا کروں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ کوئی بزرگ ہے اور اس کے ہاتھ میں کرامات ہیں لیکن فوراً بعد خیال آتا کہ یہ نشہ کرنے والا کوئی دھوکہ باز ہے اور پکّا بدمعاش ہے۔ مجھے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازہ بڑی زور سے کھُلا اور میری بیوی باہر نکلی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ غصّے میں ہے۔ اُس نے مجھے کہا — 'چلو اُٹھو یہاں سے' — اور وہ باہر کو چل پڑی....

"پھر شاہ باہر نکلا۔ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہ نے کہا — 'اُس کافر نے تمہاری بیوی پر بہت بُرا اثر کیا ہُوا ہے۔ تمہاری بیوی میری بے ادبی کر کے

نکل گئی ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ حرکت اُس کافر نے کی ہے‘ — میں نے شاہ کی یہ بات سُنی اور باہر نکل گیا۔ بیوی باہر کھڑی تھی۔ غصّے سے اُس کی سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا ہُوا ہے۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ اُس نے خود مجھے کہا تھا کہ اس شاہ کو بھی آزما لیتے ہیں۔ اگر میں اُسے اُس کی مرضی کے خلاف وہاں لے جاتا تو اُس روز وہ جُوتی اتار کر میرے سر پر مارتی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ شاہ اُسے اندر لے گیا اور جاتے ہی پہلی بات یہ کہی — ’دیکھ لڑکی! یہ آدمی مٹی کا بُت ہے۔ یہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا‘ — اس قسم کی بکواس کر کے اُس نے میری بیوی کے ساتھ بڑی بے ہُودہ حرکتیں شروع کر دیں اور کہنے لگا کہ اس کے بغیر جن ٹلے گا نہیں۔ شاہ نے اور زیادہ ذلیل حرکتیں شروع کر دیں۔ میری بیوی سمجھ گئی اور وہ باہر نکل آئی۔ وہ جب دروازے کی زنجیر کھول رہی تھی اُس وقت شاہ نے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا تھا لیکن زنجیر کھُل گئی اور شاہ پیچھے ہٹ گیا....

”میری بیوی نے اُس کے گھر سے کچھ دُور لے جا کر مجھے کہا — ’میں مجبور ہو کر تمہیں یہاں لائی تھی۔ ایک طرف تم اتنے بہادر بنے پھرتے ہو کہ بھیڑیوں سے نہیں ڈرے اور انہیں بھگا دیا، دوسری طرف تمہارا یہ حال ہے کہ بیوی کو دیکھ کر مر جاتے ہو۔ اگر تم ایسے ہی رہے تو معلوم نہیں مجھے کس کس کے دروازے پر ذلیل ہونا پڑے گا‘ — وہ اس قدر غصّے میں تھی کہ اُس نے نفرت سے کہا ’معلوم نہیں تمہاری غیرت کہاں مر گئی ہے‘ — اُس نے مجھے اتنے گھٹیا الفاظ کہے کہ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑا اور واپس شاہ کے گھر میں لے گیا۔ وہ پہلے کی طرح بیٹھا ہُوا تھا....

”مجھے دیکھ کر اُس نے کہا — ’تم قسمت والے ہو کہ اسے واپس لے آئے ہو ورنہ اس کا بیڑہ غرق ہو جاتا۔ اسے آگے لے آؤ‘ — میرے منہ میں جو ننگی گالی آئی وہ میں نے شاہ کو دے ڈالی۔ اُس کے پاس بیٹھے ہُوئے تین چار آدمی اکٹھے بولنے لگے۔ کوئی کہتا — ’او کم عقل! آگے ہو کر پاؤں پکڑ لے شاہ جی کے۔ تیرے کھڑے فصل جل جائیں گے‘ — کسی نے کہا — ’او بیوقوف کے بچے! تُو کوڑھی ہو جائے گا۔ سجدہ کر، سجدہ کر‘ — شاہ خاموش تھا اور میں جو منہ میں آیا

بک رہا تھا۔ میری بیوی نے بھی مجھے روکا اور چلنے کو کہا....

”میں نے شاہ سے کہا — ’تیرے ہاتھ میں کرامات ہے تو میری زبان بند کر دے۔ اس گاؤں سے تُو باہر نکلے گا تو واپس تیری لاش آئے گی‘ — اُس نے کہا — ’جا کے دیکھ تیرا گھر کس طرح لٹتا ہے اور کس طرح تیرے خاندان کا بیڑہ غرق ہوتا ہے‘ — میں اُسے مزید گالیاں دے کر آگیا“

سَیدے کو شاہ نے جو دھمکی دی تھی اور اُس کے تین چار مریدوں نے اُسے جس طرح ڈرایا تھا، یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پیر اور شاہ آج بھی دیہاتیوں کو یہی دھمکیاں دیا کرتے ہیں۔ سَیدے کی بیوی نے تو غیرت مند لڑکیوں کی طرح اپنی عزت بچالی تھی لیکن سَیدے نے اُس سے زیادہ غیرت مندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اکیلا تھا اور خالی ہاتھ بھی تھا لیکن اُس نے شاہ اور اُس کے مریدوں کو للکارا۔

”اس واقعہ کو چار دن ہو گئے ہیں“ — سَیدے نے کہا — ”اور میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہوں۔ جس روز میں شاہ کو واہی تباہی سُنا کر آیا تھا اُسی رات میری وہ حالت ختم ہو گئی جو بیوی کے کمرے میں جاتے ہی ہو جایا کرتی تھی.... میرا خیال ہے کہ میرے اندر جو گانٹھ پڑ گئی تھی وہ بیوی کے طعنوں نے کھول دی ہے۔ اُس نے مجھے ایسی باتیں کبھی نہیں کہی تھیں لیکن اُس روز شاہ کے گھر سے واپس آتے ہوئے اُس نے مجھے راستے میں بڑی سخت باتیں کہہ دیں۔ وہ بہت بھڑکی ہوئی تھی۔ اُس نے جب کہا — ’میں تمہاری بیوی ہوں، ماں تو نہیں‘ — تو میرا دماغ پھٹنے پر آگیا۔ میں نے اُسی وقت محسوس کر لیا کہ میرے اندر کچھ ہُوا ہے۔ رات کو پتہ چل گیا کہ کیا ہُوا ہے“

سَیدا اپنی اصلی حالت پر آگیا تھا لیکن اُس نے ہلکے سے ڈر کا بھی اظہار کیا کہ شاہ کی بددُعا نہ لگ جائے۔ ہم نے اُس کا یہ وہم دُور کیا اور کہا کہ اُس کا کوئی نقصان ہونا ہوتا تو اس وقت تک ہو چکا ہوتا۔ سَید اخوش خوش واپس چلا گیا۔

ہم نے اِس شاہ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ لوگوں کو ہم سَیدے اور اُس کی بیوی والا واقعہ نہیں سُنا سکتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ اُلٹا ہمیں بُرا

بھلا کہتے تھے۔ شاہ کی شہرت ہمارے گاؤں میں بھی آگئی تھی۔ ہم کہتے تھے کہ جو کچھ ہے اللہ کی ذات ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک کرشمہ دکھا دیا۔

چھ سات دن گزر گئے تو ہم نے شکار کا ارادہ کیا اور اپنے نوکر کو سَیدے کے گاؤں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ صبح ہم بہت سویرے نکلیں گے اور وہ تیار رہے۔ وہ شام کو میرے پاس آگیا۔ کہنے لگا کہ رات یہیں گزارے گا اور صبح ہمارے ساتھ شکار کو چلے گا۔

ابھی صبح اندھیری تھی جب ہم گاؤں سے نکلے۔ سَیدا کہنے لگا کہ آج پھر اُدھر ہی چلو۔ اُسے بھیڑیوں کا شکار ہی اچھا لگا تھا۔ ہم نے اُسے کہا کہ آج کسی اور طرف جائیں گے۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ کسی خطرناک جگہ چلیں جہاں خطرناک جانور ملیں۔ ہمارے علاقے میں خطرناک جانور بھیڑیا ہی تھا جو پہاڑی علاقے میں ہی مل سکتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ سَیدا کسی خطرناک جگہ جانا چاہتا ہے۔ چلو اسے رَکھ سلیمان لے چلتے ہیں۔

اگر آپ نے میری کہانی "رَکھ سلیمان کی الیشری" پڑھی ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ وہ جگہ کتنی ڈراؤنی تھی۔ اب تو وہ جگہ ویسی نہیں رہی۔ بارشوں نے اُس کے خدوخال ہموار کر دیئے ہیں۔ اس کی ہیبت ختم ہوگئی ہے۔ ہماری جوانی کے وقت تو اُدھر سے گزرنے کی کوئی جُرأت نہیں کرتا تھا۔ وہاں کوئی خوفناک درندہ نہیں تھا۔ وہ جگہ خوفناک تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہاں بَدروحیں اور شریر شرار رہتے ہیں۔ وہاں بَڑ کے درخت بھی تھے جن میں گِدھوں اور چیلوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔

میں اُس جگہ کی ہیبت کو پُوری طرح بیان کر کے کہانی کو اور لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ آپ "رَکھ سلیمان کی الیشری" ایک بار پھر پڑھ لیں۔ وہاں سے ہم نے ایک ڈاکو کو پکڑا تھا۔ وہ جگہ ڈاکوؤں اور چوروں کے لیے موزوں تھی۔ سَیدے کے کہنے پر ہم اُس روز اُدھر کو چل پڑے۔ جب اُس علاقے میں داخل ہوئے تو سورج نکل رہا تھا۔ ہم نے یہ جگہ ایک بار پہلے دیکھی تھی اس لیے ہم نڈر ہو کر چلتے گئے۔ ہمارا ایک ساتھی سَیدے کو سنانے لگا کہ یہاں سے ہم نے ایک ڈاکو اور ایک اغوا

کی ہوئی لڑکی کو پکڑا تھا۔ کسی نے کہا کہ چلو پہلے وہ جگہ دیکھتے ہیں۔

وہ جگہ کنوئیں کی شکل کی تھی لیکن یہ وسیع کنواں زمین کے اُوپر تھا۔ مٹی کی دیواریں گولائی میں کھڑی تھیں۔ ان میں شگاف تھے۔ دُور پیچھے کہیں سے پانی مرتا تھا اور زمین کے اندر اندر اس جگہ آکر نکلتا تھا۔ وہاں غار بنا ہُوا تھا۔ اس میں پانی ساون کی بارشوں کے دوران آتا تھا۔ باقی تمام موسموں میں یہ غار جو معلوم نہیں کتنی دُور تک گیا ہُوا تھا، خشک رہتا تھا۔

اس جگہ کے ایک طرف برساتی نالہ تھا۔ اسی طرف سے اندر جانے کا راستہ تھا۔ ہم اس کے اندر چلے گئے۔ آگے راستہ مُڑتا تھا۔ ہم راستہ مُڑنے تو ایک آدمی جو رفع حاجت کے لیے بیٹھا تھا، اُٹھ کر دوڑ پڑا۔ وہاں قریب کوئی آبادی نہیں تھی اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ قریب کے گاؤں کا کوئی آدمی ہے۔ یہ کسی اور مقصد کے لیے وہاں آیا تھا۔ ہم اُدھر کو دوڑے۔ وہاں ایک اور شگاف تھا۔ وہ آدمی اس کے اندر گیا تھا۔ ہم بھی اندر چلے گئے۔

یہ جگہ بھی زمین کے اُوپر کنوئیں جیسی تھی۔ مٹی کے ٹیلے گولائی میں کھڑے تھے۔ یہ کنواں تھوڑا سا تنگ تھا۔ وہاں دو آدمی دیکھے۔ وہ دو ٹرنکوں پر بیٹھے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم نے اُن کے قریب جا کر پوچھا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں تو ایک نے کہا کہ وہ بڑی دُور جا رہے ہیں۔ رات یہاں گزاری ہے۔

وہ ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ سَیدا بول پڑا — "انہیں میں شاید جانتا ہوں.... کیوں بھائیو! تم ڈھوک والے شاہ کے پاس نہیں بیٹھے ہُوئے تھے؟ تم نے مجھے میری بیوی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا؟ میں نے شاہ کو گالیاں دی تھیں تو تم نے مجھے ڈرایا نہیں تھا؟"

انہوں نے انکار کیا تو ہم سب اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ جھوٹ بول رہے تھے کہ وہ کہیں جا رہے تھے۔ وہ جگہ رات گزارنے کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ مختصراً یہ کہ ہم نے انہیں کہا کہ ہم اُن پر کُتے چھوڑ دیں گے، وہ سچ بولیں۔ آخر انہوں نے ایسا سچ بولا کہ ہم ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے

لگے۔

سچ یہ تھا کہ وہ شاہ کے آدمی تھے۔ گزشتہ رات انہوں نے سیدے کے گھر نقب لگائی اور یہ دو ٹرنک نکال لائے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ وہ شاہ کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ ٹرنک سے زیورات نکال کر شاہ کو دینے گیا تھا۔ بات بالکل صاف تھی۔ شاہ ان ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا۔ ٹرنکوں میں کپڑے وغیرہ تھے۔ یہ واردات شاہ نے کروائی تھی۔ وہ سیدے سے اپنی بے عزتی کا انتقام لے رہا تھا اور اپنی اس بددعا کو صحیح ثابت کر رہا تھا جو اُس نے سیدے کو دی تھی کہ دیکھ تیرا گھر کس طرح لُٹتا ہے۔

ان آدمیوں نے ہمارے ساتھ سودا بازی شروع کر دی۔ وہ ہم سے رہائی مانگتے تھے۔ شاہ کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ وزیر آباد کے دیہاتی علاقے کا پیشہ ور ڈکیت ہے اور مفرور ہے۔ سیدا دو لڑکوں کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں کو چلا گیا۔ باقی سب لڑکے وہیں رہے تاکہ یہ آدمی بھاگیں نہیں اور مال سمیت پکڑے جائیں۔

ہمیں بہت وقت انتظار کرنا پڑا۔ ہمیں بڑا موٹا شکار مل گیا تھا۔ سیدا اپنے باپ، بھائی، نمبردار اور گاؤں کے دو تین آدمیوں کے ساتھ آ گیا۔ پولیس بھی ان کے ساتھ تھی۔ گزشتہ رات سیدا ہمارے گاؤں میں تھا۔ اُس کے گھر نقب رات کے آخری پہر لگی اور یہ مُجرم دو ٹرنک اُٹھا کر یہاں آ گئے اور سو گئے۔ اِدھر ایسا خطرہ نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ سیدا ہمارے ساتھ شکار پر آ گیا۔ صبح اُس کے گھر والوں کو پتہ چلا کہ وہ تو لُٹ گئے ہیں۔ سیدے کا باپ نمبردار وغیرہ کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔ اِدھر سے سیدا گاؤں پہنچا اور وہ بھی تھانے کو چل پڑا۔ اُسے تھانیدار آدھے راستے میں آتا مل گیا۔ اُس نے ان سب کو بتایا کہ گاؤں میں جانے کی بجائے اُس کے ساتھ چلیں، چور بمع مال پکڑے گئے ہیں۔

یہ اتفاق معجزے سے کم نہ تھا۔ اگر ان آدمیوں کو ہم نہ دیکھ لیتے تو شاہ پر کوئی بھی شک نہ کرتا۔ پولیس نے انہیں گرفتار کیا اور ان کی نشاندہی پر شاہ کو جا پکڑا اور سیدے کے گھر کے زیورات اُس کے گھر سے برآمد ہوئے۔ اُسے اور اُس کے

تیسرے آدمی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے شاہ کی پچھلی ہسٹری وزیر آباد سے حاصل کر لی تھی۔ اُس کے خلاف ڈکیتی اور نقب زنی کے چار پانچ کیس تھے۔ اُسے مجموعی طور پر اکتالیس سال سزائے قید دی گئی تھی۔ اُس کے ساتھیوں کو تین تین سال قید ملی تھی۔

البتہ یہ شاہ یہ تو کہہ سکتا تھا کہ سیدے پر کالے جادو کا اثر تھا یا جنّات کا یا یہ جیسا اثر بھی تھا، اُس سے سیدے کو نجات دلانے میں شاہ کا ہی ہاتھ تھا۔

قصّہ پیار کے قاتل کا

ایسے لگتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ آج کی نسل کہتی ہے کہ وہ پسماندگی کا دَور تھا۔ میں کہتا ہوں کہ دَور جیسا کیسا بھی تھا اُس وقت نوجوان زندہ اور بیدار ہوتے تھے اور اُن کے ضمیر پر آج کے نوجوانوں کی طرح کوئی بوجھ نہیں ہوتا تھا۔ خلوص اور صاف گوئی کا زمانہ تھا۔ امن اور سکون تھا۔

ہاں تو قصہ یہ ہُوا کہ ہمارے گاؤں میں دو مسافر ذرا سستانے کو رُکے۔ لوگ اپنے پاؤں پر یا گھوڑے ٹٹو کی پیٹھ پر سفر کیا کرتے تھے۔ راستے میں کسی گاؤں میں ذرا سستانے اور حُقّے کا کش لگانے کو رُک جایا کرتے اور ان کی زبانی ہمیں دوسری جگہوں کی خبریں ملا کرتی تھیں۔ یہ دو مسافر تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کے تھے۔ ہمارے گاؤں سے فاصلہ بارہ تیرہ میل تھا۔ یہ مسافر جب ہمارے گاؤں میں بَڑ کے درخت کے نیچے رُکے، اُس وقت میں اور میرے دو دوست اپنے کُتّوں کو لیے وہاں بیٹھے تھے۔

ایک مسافر نے ہمارے کُتّے دیکھ کر کہا کہ اُن کے گاؤں کے ایک ہم جیسے نوجوان کو دو کتوں نے اتنا زخمی کر دیا کہ وہ مر گیا۔ کُتّے دو تھے۔ دونوں لڑنے والے بُوہلی (بُل ڈاگ) تھے۔ اُس زمانے میں کتوں کی لڑائی ایک عام اور دلچسپ کھیل ہُوا کرتا تھا۔ بعض آدمی خونخوار قسم کے بُوہلی کُتّے پالتے اور ایک دوسرے کو چیلنج بھیج کر کُتّے لڑایا کرتے تھے۔ دُور دُور سے لوگ تماشہ دیکھنے آتے۔ ڈھول بجتے اور میلے کا منظر ہوتا تھا۔ بعض تماشائی جو جُوئے کے عادی تھے، کتوں پر نقد شرطیں لگاتے تھے۔

وہ دو کُتّے جنہوں نے ایک نوجوان کو مار ڈالا تھا ایک شاہ جی کے تھے مجھے یاد نہیں کہ اُس نوجوان کا نام کیا تھا جو کتّوں کا شکار ہو گیا تھا۔ قصّہ سنانے کے لیے اُسے انور کہہ لیں۔ وہ اعوان ذات کا تھا۔ ان مسافروں نے سنایا کہ صبح سویرے شاہ جی کے دو نوکر یا مرید اُس کے دونوں کُتّوں کو باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے گئے۔ وہ کھیتوں سے آگے ویرانے میں چلے گئے اور انہوں نے کُتّوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ انور کہیں سے آ رہا تھا یا کہیں جا رہا تھا۔ نوکروں کا بیان یہ تھا کہ انور ایک کھڈ سے اُوپر آیا تو اچانک اُوپر ایک کُتّا اُس کے سامنے آ گیا۔

انور گھبرا گیا۔ اُس نے کُتّے کو ڈھیلا اُٹھا کر مارا۔ کُتّا لڑاکا بُوہلی اور خونخوار تھا۔ اُس نے انور پر حملہ کر دیا۔ دوسرا کُتّا بھی دوڑا آیا اور اپنے ساتھی کی دیکھا دیکھی وہ بھی انور پر ٹوٹ پڑا۔ نوکر دُور تھے۔ اُن کے پہنچنے تک دونوں کُتّے انور کو بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر مار چکے تھے۔ نوکروں نے کتّوں کو زنجیریں ڈالیں اور واپس آ کر شاہ جی کو بتایا کہ کیا ہو گیا ہے۔ گاؤں میں خبر پہنچی تو سارا گاؤں دوڑا گیا۔ انور کی لاش خون میں ڈوبی پڑی تھی۔

نوکروں نے سب کو بتایا کہ یہ حادثہ کس طرح ہُوا ہے۔ انور کا باپ اپنے جوان بیٹے کی موت پر پاگل ہو رہا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تھانے جائے گا۔ لوگوں نے اُسے یاد دلایا کہ وہ شاہ جی کے خلاف بک رہا ہے۔ وہ خود بھی شاہ جی کا مرید تھا۔ سب نے اسے کہا کہ اس کے بیٹے کو شاہ جی نے تو نہیں مروایا۔ غلطی اس کے بیٹے کی تھی کہ اُس نے کُتّے کو ڈھیلا مارا۔

شاہ جی کی مریدی کا حلقہ خاصا بڑا تھا۔ شاہ جی نے اُسی وقت اعلان کر دیا کہ وہ انور کے باپ کو پانچ سو روپیہ دے گا۔ اُس وقت کے پانچ سو روپے آج کے پانچ ہزار سے بھی زیادہ رقم تھی۔ دیہات میں پانچ سو روپیہ نقد معاوضہ سُن کر لوگوں پر حیرت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ شاہ جی نے رقم ادا کر دی اور انور کو دفن کر دیا گیا۔ شاہ جی پہلے ہی شاہ جی تھا، اب اس کی فیاضی کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ حاتم طائی بن گیا۔ لوگوں نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ شاہ جی نے کون سی محنت مزدوری کر کے یہ رقم کمائی ہے۔ یہ انہی لوگوں سے نذرانوں اور سلامیوں کی صورت میں بٹوری

گئی تھی۔

انہی دنوں شاہ جی کی بیٹی کی شادی تھی۔ اُس کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ گاؤں والوں پر مزید اثر ڈالنے کے لیے شاہ جی نے کہا کہ وہ بیٹی کی شادی انور کے چہلم کے بعد کرے گا۔ ہمیں یہ واقعہ سنانے والے مسافر کہتے تھے کہ یہ شاہ جی کی ایک ہی بیٹی تھی اور بہت خوبصورت۔ ہنسنے کھیلنے اور بھاگنے دوڑنے والی زندہ دل لڑکی تھی۔ انور کی موت کے تیسرے روز اس سے بھی خوفناک حادثہ ہو گیا۔ صبح شاہ جی کو اطلاع ملی کہ اُس کے دونوں کُتّے مرے پڑے ہیں۔ شاہ جی دوڑا گیا اور اپنے کتّوں کو مرا ہُوا دیکھا۔

پہلا خیال یہ آیا کہ یہ انور کے باپ یا بڑے بھائی یا ہو سکتا ہے اُس کی ماں کی انتقامی کارروائی ہو۔ شاہ جی کی پہلی للکار یہی تھی کہ اُس (انور کے باپ) نے پانچ سو روپیہ نقد لے کر بھی یہ حرکت کی ہے ——"ہم اس کا گھر جھگا ایک پھونک مار کر جلا دیں گے"—— مگر ایک اور اطلاع نے شاہ جی کے ہوش گم کر دیئے۔ اطلاع یہ تھی کہ اُس کی اکلوتی بیٹی کی لاش جس کی شادی ہونے والی تھی انور کی قبر پر پڑی ہے۔

اب بھی شاہ جی نے یہی شک کیا کہ یہ بھی انور کے رشتہ داروں کی کارستانی ہے کہ انہوں نے اس کی بیٹی کو گھر سے اٹھایا اور قتل کر کے لاش انور کی قبر پر پھینک دی لیکن لاش کے جسم پر کوئی ضرب یا خراش تک نہیں تھی۔ بہرحال یہ کھوکھلا شک تھا۔ شاہ جی کے گھر سے اُس کی جوان بیٹی کو اُٹھا لانا انور کے باپ یا کسی اور رشتہ دار بلکہ ڈاکوؤں کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ شاہ جی کو اور زیادہ شک کرنے کا موقعہ نہ ملا کیونکہ پولیس آ گئی تھی۔ نمبردار نے اپنا فرض سمجھا تھا کہ فوراً تھانے اطلاع دے دے کہ شاہ جی کی بیٹی کی لاش قبرستان میں پڑی ہے۔ اس رپورٹ پر تھانیدار گھوڑا دوڑاتا آ دھمکا۔

مسافروں نے سنایا کہ یہ تھانیدار سرگودھا ضلع کا رہنے والا ہے اور اپنی ڈیوٹی کا بہت ہی سخت ہے۔ شاہ جی نے اسے الگ کر کے اس کے ساتھ نہ جانے کیا باتیں کی تھیں۔ سب کہتے تھے کہ انور کے خاندان کے سارے

مرد پکڑے جائیں گے اور تھانے میں اُن کو مار اپیٹا جائے گا، لیکن تھانیدار نے نہ کسی کو گرفتار کیا نہ کسی کو مشتبہ بٹھایا۔ وہ لاش اٹھوا کر لے گیا۔ گاؤں والوں نے یہ بھی دیکھا کہ پولیس شاہ جی کے دونوں مرے ہوئے کتّوں کو بھی اُٹھا لے گئی تھی۔ آٹھ دس دنوں بعد لوگوں کو پتہ چلا کہ کتّوں کو زہر دے کر مار اگیا تھا اور یہی زہر شاہ جی کی بیٹی کو دیا گیا تھا، لیکن سب حیران تھے کہ لاش انور کی قبر پر کس طرح پہنچی۔

یہ کوئی معمّہ نہیں تھا۔ عشق اور مُشک چھپے نہیں رہتے۔ یہ بات بھی سنی سنائی گئی کہ انور کا سارا خاندان شاہ جی کا مرید تھا اور انور جو بڑا خوبصورت نوجوان تھا، شاہ جی کے گھر جاتا رہتا تھا۔ شاہ جی اُسے اس لیے چاہتا تھا کہ اس کی آواز میں سوز اور درد تھا۔ وہ سیف الملوک گایا کرتا تھا۔ شاہ جی چرس یا شراب کے نشے کی حالت میں انور سے سیف الملوک سنا کرتا تھا۔ شاہ جی کی بیٹی انور کو چاہتی تھی اور وہ انور کے گھر آیا کرتی تھی۔

مسافروں نے کہا کہ پہنچ والے بزرگوں کے گھر میں نیت خراب کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ انور کو شاہ جی کی گدّی کی بد دعا لگی اور وہ کتّوں سے چیر اپھاڑا گیا۔ شاہ جی نے مشہور کیا کہ اُس کے کسی دشمن نے اُس کے خلاف دو شیطان جنّات کو استعمال کیا ہے اور اب وہ اپنے دشمن پر اپنے جنّات سے جوابی حملہ کرائے گا۔ شاہ جی کے مرید اور غیر مرید حیران تھے کہ پولیس نے کیس چلایا کیوں نہیں۔ شاہ جی کے کان میں پڑی تو اُس نے کہا کہ پولیس جنّات اور بھوت پریت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ لوگ سوچ سوچ کر تھک گئے کہ کتّوں کو اور لڑکی کو ایک ہی قسم کا زہر کس نے دیا۔ آخر وہ مان گئے کہ یہ شاہ جی کے دشمن جنّات کا حملہ تھا۔

دونوں مسافر یہ واقعہ سنا کر اور حقہ پانی پی کر چلے گئے۔ ہمارے گاؤں میں تین چار دن اس واقعہ پر باتیں ہوتی رہیں اور یہ بات پرانی ہو گئی۔

اس سے تقریباً ایک مہینہ بعد کا واقعہ ہے کہ ہم نے حسبِ معمول کتّوں کو ساتھ لیا اور شکار کو نکل گئے اور ایسے ویرانے میں جا پہنچے جہاں دُور دُور

تک آبادی نہیں تھی۔ وہاں کھڈ تھے۔ جگہ نشیبی تھی۔ کیکر، شیشم اور پھلاہی کے درخت تھے اور ٹیلے ستونوں کی طرح کھڑے تھے۔ مٹی کی اُونچی دیواریں بھی تھیں اور ان میں "پانی مار" کے راستے بھی تھے جو غاروں کی طرح تھے۔ اس سے پہلے ہم وہاں کبھی نہیں گئے تھے کسی نے بتایا تھا کہ وہاں سیہہ، گوہ اور گیدڑ رہتے ہیں لیکن خرگوش نہیں ہوتے کیونکہ وہاں بھیڑئیے اور لومڑ بھی ہوتے ہیں۔

ہمیں بھیڑئیے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی خونخواری اور درندگی کے بڑے خوفناک قصّے سنے تھے۔ بھیڑیوں کے وہ دو تین واقعات بعد میں ہوئے تھے جو میں آپ کو اپنی کہانیوں میں سنا چکا ہوں۔ ہمارا اصول لڑکپن ہی میں پختہ ہو گیا تھا کہ جہاں خطرہ ہو وہاں ضرور جاؤ اور جس کا خوف ہو اُسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔

وہ خطرہ اور وہ خوف بغیر اطلاع و توقع ہمارے سامنے آگیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ وہ کُتّے ہیں لیکن دونوں ایک جیسے تھے۔ رنگ ایک سا اور شکل ایک سی۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ بھیڑئیے ہیں۔ ہم سب رُک گئے اور ذرا پیچھے ہٹ آئے۔ فاصلہ ایک سو قدم سے زیادہ تھا۔ وہ جوڑا نیچے تھا۔ ہم بلندی پر تھے۔ جوڑا عشق و محبت اور راز و نیاز میں مگن تھا۔ اس رومانی کیفیت میں جانور ہو یا درندہ ارد گرد کی دنیا سے بے خبر ہوتا ہے۔ اسے آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے لیکن اسے پتہ چل جائے کہ وہ خطرے میں آگیا ہے تو بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔

میرے دو ساتھی چُھپ چُھپ کر آگے گئے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ بھیڑئیے ہیں۔ وہ جگہ مٹی کی عمودی دیواروں اور ڈھلانوں سے گھری ہوئی تھی۔ درمیان میں ستونوں کی طرح ٹیلے کھڑے تھے اور کچھ درخت بھی تھے۔ ہم دوسری طرف نیچے چلے گئے اور اندر جانے کا راستہ دیکھ لیا۔ اس میں داخل ہوئے تو بھیڑیوں کا جوڑا دس قدم کے فاصلے پر کھڑا پیار و محبت میں مصروف تھا۔ دونوں نے اِدھر دیکھا۔ دونوں دانت نکال کر غرّائے۔ میں نے پہلی بار بھیڑئیے کے وہ لمبے دانت دیکھے جن سے یہ درندہ اپنے شکار کو اور انسانوں کو چیرتا

پھاڑتا ہے۔ سوچنے کا وقت ہی نہ ملا۔ میں اپنے دوست افضل کے ساتھ سب سے آگے تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے کُتّے کی زنجیر کھول دی۔

درندہ اگر شیر یا چیتا ہو تو وہ بھی خطرہ دیکھ کر بھاگ اُٹھتا ہے، یہ تو بھیڑیئے تھے لیکن ان پر کوئی اور ہی مُوڈ طاری تھا۔ نر بھیڑیا غرّا کر ہمارے کتّوں کی طرف آیا۔ ہمارے دوسرے ساتھی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھی کُتّے کھول دیئے۔ بھیڑیا اس قدر غصّے میں تھا کہ اُس نے افضل کے کُوبلی پر ایسا وار کیا کہ کوبلی کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مادہ میرے کُتّے پر آئی لیکن نو دس کُتّوں نے انہیں گھیرا تو دونوں بھیڑیئے بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے ان کا غصّہ اور ان کی دلیری دیکھی۔ وہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دُم دبا کر نہیں بلکہ دلیری سے لڑ رہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں ڈنڈے اور دو کلہاڑیاں تھیں لیکن ہم کتّوں کی مدد نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے جس کُتّے پر بھیڑیئے کا پنجہ یا دانت پڑتے وہ بلبلا اٹھتا تھا لیکن کُتّے زیادہ تھے۔ اگر مقابلہ دو اور دو کا ہوتا تو بھیڑیئے جیت جاتے۔ پھر بھی بھیڑیئے ہی جیت رہے تھے۔ انہوں نے کُتّوں کا حلقہ توڑ دیا اور نکل بھاگے لیکن غلط طرف بھاگے۔ اس وسیع نشیب میں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جدھر سے ہم داخل ہوئے تھے۔ بھیڑیئے بھاگتے دوڑتے باہر نکلنے کا راستہ دیکھ رہے تھے اور کتّے ان کے تعاقب میں تھے۔ اس جگہ لمبوترے ٹیلے اور درخت بھی کھڑے تھے اس لیے بھیڑیئے کتّوں کے ہاتھ نہیں آتے تھے۔ وہاں تو ایک قسم کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی تھی۔ پھر ایسے ہُوا کہ ہمیں اپنے کتّے ہی ٹیلوں اور درختوں کے ارد گرد بھاگتے دوڑتے نظر آنے لگے اور بھیڑیئے لاپتہ ہو گئے۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ اُس نے ایک ڈھلان پر بھیڑیوں کو چڑھتے دیکھا تھا۔

ہم نے کتّوں کو پکڑ پکڑ کر اکٹھا کیا تو دیکھا کہ تین کتّوں کا خون بہہ رہا تھا۔ بھیڑیوں نے ان کی کھال چیر دی تھی۔ کتّے بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ یہ معرکہ بہت دلچسپ تھا۔ ہم وہاں سے باہر نکلے اور ایک اور طرف چل پڑے۔ ہم کسی

سر سبز جگہ بیٹھ کر سستانے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ نشیبی علاقے سے اوپر گئے تو کچھ درختوں کے جُھنڈ اور ہریالی نظر آئی۔ ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ راستہ گذرتا ہے۔ ہم درختوں کے ایک جھنڈ تلے بیٹھ گئے۔ سب اپنے ساتھ کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لائے تھے۔ پراٹھے تو سب کے پاس تھے۔ کوئی انڈے پکوا لایا تھا، کسی کے پاس ساگ تھا اور دو تین دوست دال لائے تھے۔ پیاز اور اچار بھی تھا۔ آپ تصور میں نہیں لا سکتے کہ اتنے سادہ کھانے میں کیا لذت ہوتی ہے۔

ہم نے کھانا شروع کیا ہی تھا کہ ڈیڑھ دو سو گز دُور ایک گھوڑسوار اس طرح نظر آیا جیسے زمین سے اُبھرا ہو۔ وہاں سے راستہ نیچے چلا جاتا تھا۔ گھوڑسوار کے ساتھ تین آدمی تھے جو پیدل آ رہے تھے۔ گھوڑسوار کی سیاہ داڑھی تھی اور اُس کا چہرہ اور جسم بھرا بھرا تھا۔ ہم کھانے میں مصروف رہے۔ اچانک ایک طرف سے ایک اونٹ نمودار ہُوا۔ وہ جیسے زمین سے ہی اُبھرا تھا۔ وہ علاقہ ہی ایسا تھا۔ کہیں کہیں سے زمین گہرائی میں چلی جاتی تھی۔ اونٹ گھوڑسوار کے دائیں طرف کوئی پچاس گز دُور ہو گا۔ سوار اور اُس کے ساتھیوں نے اونٹ کو نہ دیکھا۔ انہیں دیکھ کر اونٹ اُن کی طرف دوڑ پڑا اور اُس نے ایسی خوفناک آواز نکالی جیسے اُسے کوئی پیٹ رہا ہو۔

گھوڑسوار نے اُدھر دیکھا۔ اُونٹ اُس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے کہا — "اونٹ مست ہے" — مست کا مطلب تھا باؤلا۔ ہمارے ساتھی نے کہا — "وہ دیکھو، اس کے منہ سے جھاگ گر رہی ہے" — اس کے ساتھ ہی ہمارے اس ساتھی نے چلّا کر سوار سے کہا — "بھاگو، گھوڑے کو ایڑ لگاؤ۔ اونٹ مست ہے" — مگر سوار اپنی طرف آتے ہوئے اونٹ کو دیکھتا رہا۔ جب اونٹ قریب آ گیا تو سوار کے ساتھیوں نے گھبرا کر کہا — "شاہ جی! اونٹ مست ہے"

معلوم نہیں یہ کیسے ہُوا کہ گھوڑا کسی اور طرف دوڑنے کی بجائے ایسی سمت دوڑا کہ اونٹ کے راستے میں آ گیا۔ سوار نے شاید لگام کو غلط جھٹکا دیا

تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جو ہونا ہوتا ہے اس کے لیے سبب بن جاتا ہے۔ سوار نے اُس وقت گھوڑے کو موڑا جب اونٹ اُس کے سر پر آگیا تھا۔ اُونٹ نے سوار کے کندھے پر اُس جگہ منہ ڈالا جہاں بازو اور کندھے کا جوڑ ہوتا ہے۔ اُونٹ نے اتنے ہٹے کٹے اور وزنی آدمی کو اس طرح گھوڑے سے گھسیٹ لیا جیسے بلی چوہے کو اُٹھا لیتی ہے۔ گھوڑا بغیر سوار کے آگے نکل گیا۔ سوار چیخنے چلانے لگا اور اُونٹ اُسے بھنبھوڑنے لگا۔

اُس کے ساتھیوں میں سے ایک کے پاس کلہاڑی اور باقی دو کے پاس لاٹھیاں تھیں۔ انہوں نے اونٹ پر حملہ کر دیا۔ اِدھر سے ہم دوڑے۔ ہمارے پاس ڈنڈے اور دو کلہاڑیاں تھیں۔ ہم ڈرتے اس لیے تھے کہ اُونٹ مست تھا۔ وہ سوار کو چھوڑ کر کسی اور کو منہ میں لے سکتا تھا۔ ہمارے پہنچنے تک سوار کے ساتھیوں نے ایک کلہاڑی اور دو لاٹھیوں سے اونٹ کا یہ حال کر دیا تھا کہ جہاں جہاں اسے کلہاڑی لگی تھی وہاں سے بے تحاشا خون بہ رہا تھا۔

اس اونٹ کا علاج یہی تھا کہ اسے مار دیا جائے۔ اتفاق سے ہم نے کتوں کو درختوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اگر کھُلے ہوتے تو ہمیں دیکھ کر اُونٹ پر ٹوٹ پڑتے۔ جس کتے کے دانت اونٹ کے جسم میں اترتے وہ باؤلا ہو جاتا۔

اونٹ نے سوار کو چھوڑ دیا اور بہت خوفناک آوازیں نکالتا ہُوا ہم میں سے کسی کو کاٹنے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنے لگا لیکن کلہاڑیوں نے اس کی پچھلی ٹانگیں اتنی زیادہ کاٹ دی تھیں کہ وہ رُکا اور گر پڑا۔ اتنے میں تین چار آدمی دوڑتے، ہانپتے کانپتے آئے۔ وہ اُونٹ کے تعاقب میں آئے تھے۔ دُور سے ہی انہوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا — "اس کے آگے نہ ہونا مست ہے۔ مارے جاؤ گے۔"

یہ سب شُتر بان تھے۔ سوار کے کندھے سے اتنا خون بہہ رہا تھا کہ اُس کے کپڑے گہرے سُرخ ہو گئے اور وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ ہم نے اُونٹ کی پیٹھ کے پچھلے حصے پر اتنی کلہاڑیاں ماریں کہ اُس کی ہڈیاں کاٹ دیں۔ اس کے آگے ہو کر ہم اُس کے سر پر کلہاڑی نہیں مار سکتے تھے۔ اس کے منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ سوار کے ساتھیوں نے اُس کا گھوڑا پکڑا اور اُسے اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا۔ وہ ہوش میں تھا۔ وہ تینوں اپنے ساتھی کو لے گئے۔ ہم پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ اُن سے پوچھ ہی نہ سکے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ شتربان رہ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اونٹ بدمست ہو گیا اور نکیل تڑوا کر بھاگ نکلا۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے تھے کہ اونٹ اپنے گاؤں سے نکل آیا اور کسی اور گاؤں میں نہ گیا ورنہ بہت نقصان کرتا۔ وہ کلہاڑیاں اور رسّے اُٹھائے اونٹ کے پیچھے آئے تھے

آپ شاید حیران ہوں گے کہ اونٹ نے انسان کو کاٹ کھایا۔ آپ نے چند سال پہلے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ لاہور کے چڑیا گھر کا ایک ہاتھی مست ہو گیا تھا اور اُسے گولی مار دی گئی تھی۔ اسی طرح کوئی کوئی اُونٹ بھی مست ہو جاتا ہے۔ ہمارے علاقے میں سڑکیں تو بن گئی ہیں لیکن علاقہ ایسا ہے کہ باربرداری کے لیے اُونٹ اور گدھے کا استعمال ختم نہیں ہو سکا۔ اُس زمانے میں دیہات میں سے اناج اونٹوں پر لاد کر گوجرخان کی منڈی میں لے جایا جاتا تھا۔ شتربانوں نے کئی کئی اُونٹ رکھے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی ایک خاص موسم میں کوئی اونٹ مستی میں آجاتا تھا۔ شتربان ایسے اونٹ پر قابو پا لیتے تھے لیکن بعض اونٹ باؤلے ہو جاتے تھے۔ ایسے اُونٹ کو مار دینا پڑتا تھا۔ یہ اونٹ مستی میں آکر باؤلا ہو گیا تھا۔

ہم اس اونٹ کو دیکھتے رہے۔ بڑی خوفناک آوازیں نکالتا تھا۔ اونٹ نے ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی لیکن آدھا اُٹھ کر گر پڑا۔ اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر کلہاڑیوں کے بڑے گہرے زخم تھے جن سے خون اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔ خون بہت کم رہ گیا تو اُونٹ ایک طرف گر پڑا۔

ہم سورج غروب ہونے سے پہلے اپنے گاؤں پہنچ گئے اور سب کو دو سنسنی خیز خبریں سنائیں۔ ایک یہ کہ ہمارے کُتے دو بھیڑیوں سے لڑے تھے اور دوسری یہ کہ ایک مست اونٹ نے ایک آدمی کو زخمی کر دیا ہے۔ ہماری یہ دو

خبریں سن کر ہماری ماؤں نے ہمیں جو سنائیں وہ آج تک یاد ہیں۔ بھیڑیا اور مست اُونٹ دو بڑی خوفناک چیزیں تھیں۔ ہم ان سے بچ کر آ گئے تھے۔ ماؤں کا بس چلتا تو کتّوں کی زنجیریں کھول کر ہمیں ڈال دیتیں۔ دوسرے دن میرے گھر میں تمام ماؤں کی اعلیٰ سطح کی کانفرنس ہوئی جس میں ہمارے باپوں، دادوں اور دیگر بزرگوں کے خلاف غم و غصّے کا اظہار کیا گیا جو شکار جیسے "کُتّے کام" میں ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ماؤں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی بھی مائی اپنے لال کو شکار پر نہیں جانے دے گی مگر مائی کے لال پھر بھی شکار پر جاتے رہے۔ بُرا بھلے اور گالیاں کھاتے رہے۔ گاؤں کے باپ ماؤں کی کانفرنسوں کا وہی حشر کرتے رہے جو آج کل اعلیٰ سطح کی کانفرنسوں کا ہوتا آپ بھی دیکھ رہے ہیں۔

معلوم نہ ہو سکا کہ اُونٹ نے جس سیاہ ریش سوار کو گھوڑے سے منہ میں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا وہ کون تھا۔ ہمیں ایک ماہ بعد پتہ چلا۔ یہ خبر گاؤں گاؤں سے ہوتی ہوئی ہمارے گاؤں میں پہنچی تھی۔ ہم نے سُنی تو خدا یاد آ گیا۔ وہ سوار وہی شاہ جی تھا جس کے کتّوں نے گاؤں کے ایک نوجوان انور کو مار ڈالا تھا، پھر اُس کے دونوں کتّوں کو کسی نے زہر دے کر مار دیا اور اُس کی جوان بیٹی جس کی شادی ہونے والی تھی، زہر سے ماری گئی اور اُس کی لاش انور کی قبر پر پڑی ملی تھی۔ اس خبر کے ایک آدھ مہینہ بعد ہمارے گاؤں کا ایک آدمی جو فوج میں ملازم تھا، چھٹی پر آیا۔ اُس کے ساتھ شاہ جی کے گاؤں کا ایک آدمی فوج میں ملازم تھا۔ وہ اُن دنوں چھٹی آیا ہُوا تھا جب شاہ جی کو اُونٹ نے زخمی کیا تھا۔

یہ کہانی اس طرح بنی کہ شاہ جی کی بیٹی انور کی محبت میں دیوانی تھی۔ انور کو خدا نے شکل و صورت اور جسم بہت اچھا عطا کیا تھا اور اُس کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ لوگ رُک کر سنتے تھے۔ شاہ جی اُس کی آواز کا دیوانہ تھا۔ اُس کی بیٹی انور کے گھر اکثر جایا کرتی تھی۔ دونوں نے محبت کو بدنام نہ ہونے دیا۔ وہ کبھی بھی کھیتوں میں یا کہیں باہر جا کر نہ ملے۔ صرف دو عورتوں کو ان کی محبت کا علم تھا۔ ان میں ایک شاہ جی کی بیوی تھی اور دوسری شاہ جی کی ایک خاص مُریدنی

راز ایک نہ ایک دن کُھل ہی جاتا ہے۔ شاہ جی نے اپنی بیٹی کی شادی

کسی اور گاؤں کے ایک لڑکے سے طے کر دی۔ دن بھی مقرر کر دیا۔ لڑکی ہنسنے کھیلنے والی اور دل گُردے والی تھی۔ اُس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ انور کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گی، اور اگر اُس کے ساتھ زبردستی کی گئی تو سسرال سے بھاگ جائے گی یا زہر کھا کر مر جائے گی۔

ماں نے شاہ جی کو بتایا۔ شاہ جی نے بیٹی کو بُرا بھلا کہا کہ وہ اپنی گدّی کے مرید کو دل میں بٹھا کر گدّی کی بے ادبی کر رہی ہے۔ بیٹی نہ مانی۔ اُس نے باپ سے کہا کہ گدّی کی عزّت بچانا چاہتے ہو تو مجھے زہر دے دو۔ شاہ جی کے تعویذ اپنی بیٹی پر بے اثر ہو گئے۔ اُس نے بیٹی کا انور کے گھر جانا بند کر دیا اور انور کو حکم دیا کہ آئندہ وہ اُس کے گھر نہ آئے۔ بیٹی اتنی جرأت والی نکلی کہ ایک روز انور کے گھر چلی گئی۔ شاہ جی کو پتہ چلا تو اُس نے بیٹی سے کہا کہ تم انور کا بھی انجام دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ لینا۔

تین چار دنوں بعد شاہ جی کے بُوہلی کتّوں نے انور کو چیر پھاڑ ڈالا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انور صبح سویرے اتفاق سے وہاں چلا گیا تھا جہاں وہ کتّوں کا شکار ہو گیا یا اُسے دھوکے سے وہاں جانے کو کہا گیا تھا۔ یہ راز اس لیے نہ کھل سکا کہ جب شاہ جی اونٹ کا شکار ہو گیا تو یہ دونوں خاص مرید جو کتّوں کو باہر لے گئے اور ان سے انور کو مروایا تھا لاپتہ ہو گئے تھے کیونکہ انہیں شک ہو گیا تھا کہ راز کُھل گیا ہے اور انور کے لواحقین انہیں قتل کر دیں گے۔

شاہ جی کی بیوی اور خاص مریدنی نے یہ راز کھولا کہ شاہ جی کی بیٹی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کہ انور کو شاہ جی نے مروایا ہے۔ بیٹی نے زہر حاصل کیا۔ یہاں تک کہ شہادت مل گئی کہ اُس نے منہ مانگے پیسے دے کر اپنے ایک نوکر کے ذریعے ایک سنیاسی سے زہر منگوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ کتّوں کو اُسی نے زہر دیا اور خود بھی کھا لیا اور انور کی قبر پر جا گری اور مر گئی۔ شاہ جی نے انور کا خون ہضم کر لیا اور اپنی بیٹی کی خودکُشی کو بھی جنّات کی کارستانی کہہ کر ہضم کر لیا لیکن اُوپر ایک ذات اللہ کی ہے۔

ہمارے سامنے شاہ جی کو باؤلے اونٹ نے کاٹ لیا۔ شاہ جی دُور کے

گاؤں میں رہنے والے کسی مرید کے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے اُونٹ مل گیا۔ شاہ جی گھوڑے کو دوسری طرف موڑ کر دوڑا دیتا تو وہ اُونٹ سے بچ سکتا تھا لیکن خدا کی پکڑ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ گھوڑا اس طرح مُڑ کر چلا کہ شاہ جی کو اونٹ کے آگے لے گیا اور اُونٹ نے اُسے کندھے سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔

سزا یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ شاہ جی کے تین مرید ساتھ تھے۔ قریب کوئی ہسپتال نہ تھا۔ وہ اُسے گھوڑے پر ڈال کر اپنے گاؤں کو دوڑ پڑے۔ اُس کی ہڈی تو نہیں ٹوٹی تھی لیکن اونٹ کے دانت گہرے اُترے تھے۔ گاؤں کے ایک سیانے نے اُس کے زخم کی مرہم پٹی کر دی۔ شاہ جی اور نمبردار وغیرہ کے کہنے پر مرید کہیں دوڑے گئے اور ایک سنیاسی کو بلا لائے۔ اُس نے پٹیاں کھول کر اپنی دوائیاں لگائیں اور دو دن وہی مرہم پٹی کرتا رہا۔

اُس زمانے میں باؤلے کتے یا کسی بھی باؤلے جانور کے کاٹے کا اتنا مؤثر علاج نہیں تھا جیسا آج کل ہے۔ جسے باؤلا کُتا کاٹتا تھا وہ آدمی باؤلا ہو کر سب کو کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ وہ پاگل ہو جاتا اور کچھ دنوں بعد مر جاتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز شاہ جی نے پہلے تو ایسی خوفناک چیخیں ماریں کہ گاؤں کو ہلا ڈالا پھر وہ باہر کو دوڑ پڑا۔ اُس نے ایک آدمی کو پکڑ لیا اور اُسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے پکڑا لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ لوگ ڈرتے تھے کہ شاہ جی پہنچ والا پیر ہے اور اس پر جنّات نے قبضہ کر لیا ہے۔ سنیاسی نے سب کو بتایا کہ یہ تو باؤلا ہو گیا ہے۔

اس کا وہی علاج کیا گیا جو دیہات میں کیا جاتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے چارپائی پر گرایا اور اُس کی ٹانگیں اور بازو رسّوں سے چارپائی کے ساتھ باندھ دیئے۔ وہ چیختا اور دھاڑتا تھا۔ اُس نے تین چار راتیں سارے گاؤں کو جگائے رکھا۔ ایک رات اُس کی چیخیں خاموش ہو گئیں۔ صبح پتہ چلا کہ وہ مر گیا ہے۔ سنیاسی صبح سویرے چلا گیا تھا۔ کہتے تھے کہ شاہ جی کی بیوی نے سنیاسی سے کہا تھا کہ شاہ جی کے منہ میں زہر ڈال دے۔ سنیاسی نے زہر دے دیا ہوگا۔ اسی لیے وہ صبح سویرے چلا گیا تھا۔

حسنو کی نسل

ہمارے علاقے میں سانڈے اور چھپکلی کی قسم کا ایک جانور پایا جاتا ہے جسے گوہ کہتے ہیں۔ عام طور پر گوہ کی لمبائی اڑھائی فٹ اور اتنی ہی لمبی اس کی دُم ہوتی ہے۔ دُم کی لمبائی اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے۔ میری کہانیوں میں آپ نے گوہ کا ذکر پڑھا ہوگا۔ جن حضرات نے یہ جانور نہیں دیکھا اُن کی سہولت کے لیے ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ گوہ کا منہ سانڈے اور چھپکلی کی طرح چوڑا نہیں بلکہ لمبوترا اور نتھنے برچھی کی اَنّی کی طرح نوکدار ہوتے ہیں۔ اس کے پنجے درندوں کی طرح تیز، دانت نوکدار اور اس کی کھال بڑی مضبوط ہوتی ہے۔

گوہ کسی پر حملہ نہیں کرتی۔ اگر خطرے میں گھر جائے تو اپنی دُم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ اس کی دُم باریک ہوتے ہوتے آخر میں جا کر بہت ہی باریک ہو جاتی ہے۔ اسے گوہ ہنٹر کی طرح اپنے دشمن کو مارتی ہے۔ آپ نے فلموں میں ہنٹر دیکھے ہوں گے۔ فلموں میں یہ قیدیوں کو مارے جاتے ہیں۔ گوہ کی دُم کی ضرب ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ جسم پر جہاں پڑتی ہے وہاں خون ایک لکیر کی صورت میں جم جاتا ہے۔ کسی تنومند آدمی کو گوہ کی دُم کی تین چار ضربیں پڑ جائیں تو وہ ہوش میں نہیں رہ سکتا۔

گوہ کے پنجوں کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے۔ ہم نے ایسا مظاہرہ دیکھا تو نہیں، سنا کرتے تھے کہ بعض ڈاکو زندہ گوہ کو کمند کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ گوہ کی کمر سے مضبوط رسّہ باندھ کر اسے باہر سے مکان کی چھت پر پھینک دیا جاتا تھا۔ گوہ چھت پر پنجے گاڑ لیتی اور ڈاکو ایک ایک کر کے رسّے کی مدد سے چھت
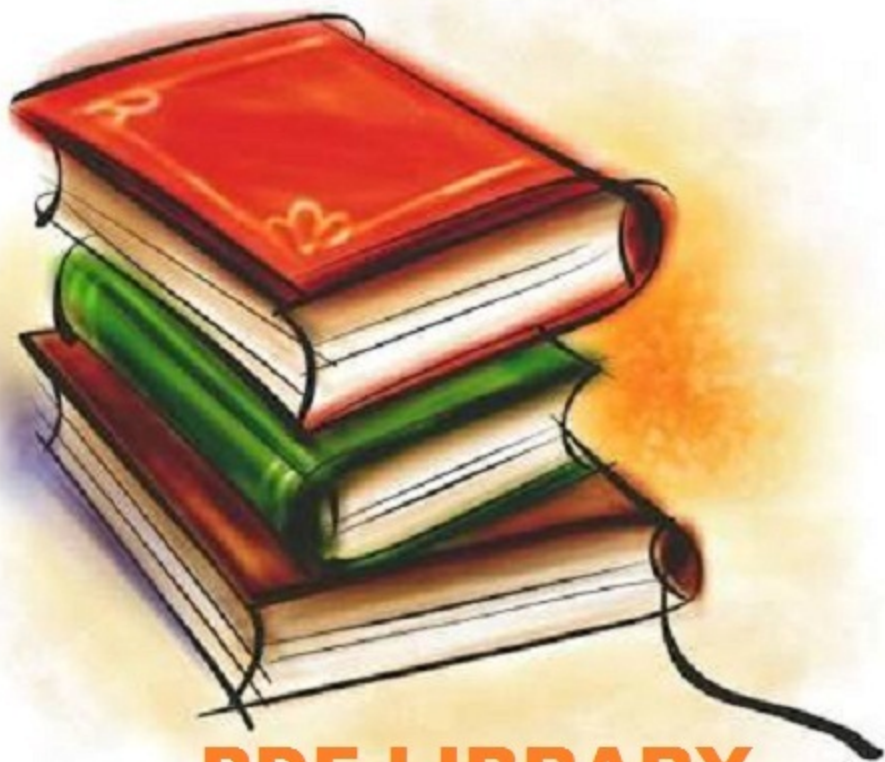
پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ گوہ پنجے نہیں اکھاڑتی تھی۔

عام سائز کی گوہ ہمارے لیے کوئی عجیب جانور نہیں تھی۔ یہ ایسے ہی تھی جیسے نیولے، گیدڑ، خرگوش اور سیہ تھے۔ لیکن ایک روز ایک آدمی نے بتایا کہ ایک گوہ نے لوگوں کا راستہ بند کر رکھا ہے اور یہ گوہ چار فٹ سے زیادہ لمبی اور اتنی ہی لمبی اس کی دُم ہے اور یہ راہ جاتے لوگوں پہ حملے کرتی ہے ابھی تک کوئی انسان اس کا شکار نہیں ہُوا تھا۔ اس نے ایک گائے اور ایک کُتے کو زخمی کر دیا تھا۔

ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ گوہ اتنی بڑی بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ گوہ اتنی ہی بڑی تھی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے امریکہ میں دنیا کا سب سے زیادہ موٹا آدمی تھا جس کا وزن چار من سے زیادہ تھا۔ وہ چار سال گزرے مر گیا ہے۔ میں نے حال ہی میں چین کی ایک جوان لڑکی کی تصویر دیکھی ہے جس کا قد سات فٹ تک پہنچ گیا ہے اور ابھی تک بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح یہ گوہ لاکھوں میں ایک تھی جو اتنی لمبی اور موٹی ہو گئی تھی۔

جس آدمی نے ہمارے گاؤں میں اس گوہ کی خبر دی وہ کسی کام سے آیا تھا۔ چار میل دُور کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے گاؤں سے تین ساڑھے تین میل دُور سے ایک راستہ گزرتا ہے جو ایک نشیب میں چلا جاتا ہے۔ یہ نشیب پچیس گز کے لگ بھگ چوڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں۔ اس میں گھاٹی اترتی اور دوسری طرف اُوپر چڑھ جاتی تھی۔ مٹی کی دیواروں میں جو اس لمبے چوڑے نشیب یا کھڈ کے کنارے تھے چھوٹے بڑے شگاف اور بِل تھے۔ ان میں خرگوش، گیدڑ، سیہ اور گوہ وغیرہ رہتے تھے۔

اس آدمی نے بتایا کہ چار مہینے گزرے ایک گھوڑ سوار نے یہ گوہ پہلی بار دیکھی۔ پہلے تو اسے وہ کوئی بلا سمجھا۔ دیکھنے میں یہ گوہ لگتی تھی لیکن اتنی جسامت کی گوہ پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ گھوڑ سوار اسے گوہ کہتا ہی نہیں تھا۔ وہ جب اس گہرائی میں سے گزر رہا تھا تو اُس کے دائیں طرف سے گوہ آئی۔ پہلے آہستہ آہستہ آئی پھر تیز ہو گئی۔ اُس نے اپنی ڈیڑھ گز لمبی دُم کو گھما کر زمین پر مارا۔ گھوڑ سوار

نے گوہ کی رفتار دیکھی جو بڑھتی جا رہی تھی تو اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ گوہ گھوڑے کے پیچھے دوڑ پڑی۔ سوار نے گھاٹی چڑھنے کی بجائے گھوڑے کو نشیب کے اندر ہی گھمانا شروع کر دیا۔ اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ہنٹر تھا جو اُس زمانے میں سوار اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔ یہ ہنٹر گوہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ گوہ کا رویہ دیکھ رہا تھا کہ یہ گھوڑے سے ڈرتی ہے یا حملہ کرنا چاہتی ہے۔

سوار تجربہ کار تھا۔ اُس نے دیکھا کہ گوہ گھوڑے کے قریب پہنچ گئی ہے تو اُس نے گھوڑا فوراً ایک طرف موڑ لیا۔ گوہ آگے نکل گئی لیکن ذرا ہی آگے جا کر مُڑ آئی۔ گھوڑ سوار نے گھوڑے کو اُس کی طرف اس ارادے سے موڑا کہ گوہ کو گھوڑے کے قدموں سے کُچل دے گا لیکن گھوڑا اُس کے قریب گیا تو گوہ نے اس کے راستے سے ہٹ کر اپنی دُم گھما کر گھوڑے کی ٹانگوں پر ماری۔ ایک زناٹہ اور شڑاپ کی آواز سنائی دی۔ گھوڑا درد سے بڑی زور سے ہنہنایا اور منہ زور ہو کر گھاٹی کی طرف دوڑ پڑا۔ اُوپر آ کر بھی وہ منہ زور اور بے لگام دوڑتا رہا۔ سوار نے بہت دُور جا کر اُسے قابو میں کیا۔

اِس جگہ سے لوگ گزرتے تھے۔ ایک روز ایک مرد اور ایک عورت یہاں سے گزرے۔ ان کے ساتھ ایک گائے تھی۔ گوہ نکل آئی۔ مرد اور عورت اُس کی جسامت دیکھ کر ہی بھاگ گئے لیکن گائے پیچھے رہ گئی۔ گوہ نے اُس پر حملہ کر دیا۔ اسے دُم کی کئی ضربیں لگائیں پھر اُچھل کر اس کے منہ کے نیچے اپنے دانت گاڑ دیئے۔ گائے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ اِسے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں مِل رہا تھا۔ اس کا پاؤں گوہ کی دُم پر پڑا تو اس کے دانت گائے کے گلے سے اُکھڑ گئے۔ اس طرح گوہ نے گائے کو تین چار جگہوں سے اس طرح زخمی کر دیا کہ ان جگہوں سے کھال اتار دی۔ آخر گائے گھاٹی چڑھ گئی اور اس کی جان بچی۔

اس کے بعد ایک آدمی اپنے کُتے کے ساتھ اِدھر سے گزرا۔ گوہ اچانک نکلی اور اس آدمی کی طرف آئی۔ کُتا بڑی اچھی نسل کا تھا۔ وہ گوہ کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ کُتے نے گوہ کو پکڑنے کی بہت کوشش کی۔ اس

کے مالک نے گوہ کو پتھر مارے اور کُتّے کو للکار للکار کر گوہ کے مقابلے میں جم کر لڑا تا رہا لیکن گوہ نے کُتّے کو دُم کی دو ضربیں لگا کر گرا دیا اور اُس کے پیٹ میں دانت گاڑ دیئے۔ کُتّا تڑپنے لگا لیکن کُتّا لڑاکا تھا۔ اُس نے گوہ کی پچھلی ایک ٹانگ منہ میں لے لی۔ گوہ نے کُتّے کے پیٹ سے دانت اکھاڑ لیے۔ آخر کُتّا بھاگ اُٹھا اور گھاٹی چڑھ گیا۔ کُتّے کا مالک دُوسری طرف بھاگ نکلا۔ کُتّا بُری طرح زخمی ہُوا تھا۔

اِس کے بعد اِدھر سے گزرنے والے چند اور لوگوں پر گوہ نے حملے کیے لیکن وہ سب بچ نکلے۔ گوہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بھاگ گئے۔ اس گہری جگہ کے قریب جو گاؤں تھے وہاں کے لوگ یوں کرنے لگے کہ کسی اجنبی مسافر کو اُس راستے پر جاتا دیکھتے تو اُسے خبردار کر دیتے کہ وہ اُوپر اُوپر جائے نشیب میں سے نہ گزرے۔ بعض لوگوں نے اُوپر سے گزرتے ہُوئے گوہ کو اس لمبے چوڑے کھڈ میں گھومتے پھرتے دیکھا۔

اس آدمی نے بتایا کہ ایک آدمی اپنے دو شکاری کُتّے لے کر گیا تھا لیکن ایک کُتّے کو گوہ سے مروا کر واپس چلا گیا۔ گوہ نے اس کُتّے کی شہ رگ منہ میں لے لی تھی اور دوسرے کُتّے کو اُس نے دُم کے زناٹوں سے اپنے قریب نہ آنے دیا۔ کُتّوں کا مالک اپنے ایک کُتّے کو مرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دوسرا کُتّا اپنے مالک کی ٹانگوں میں جا چھپا۔ مالک اور کُتّا وہاں سے کھسک آئے۔ مالک نے اُوپر آ کر دیکھا کہ گوہ مرے ہوئے کُتّے کے ارد گرد گھومتی اور اسے سونگھتی رہی، پھر نشیب کے بلند کنارے میں جا کر غائب ہو گئی۔ فوراً ہی پھر آ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے اُس کے دو بچے بھی آ گئے۔ وہ بہت چھوٹے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے مرے ہُوئے کُتّے پر چڑھ گئے اور اس کے ساتھ کھیلنے لگے۔

گوہ کے بچوں کو دیکھ کر پتہ چلا کہ یہ اپنے بچّوں کی وجہ سے ہر کسی پر حملہ کرتی ہے۔ کُتیا کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو، وہ جب بچّے جنتی ہے تو خونخوار ہو جاتی ہے۔ قریب سے کوئی درندہ گزرے تو اُس پر بھی حملہ کر دیتی ہے۔ یہ گوہ بھی اپنے بچّوں کی حفاظت کے لیے خونخوار ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس وجہ کے علاوہ اس گوہ کے خونخوار ہونے کی وجہ اس کی جسامت بھی تھی۔ یہ غیر قدرتی طور پر

اتنی بڑی ہو گئی تھی۔

ہمیں یہ تفتیش تو نہیں کرنی تھی کہ یہ گوہ اتنی بڑی کیوں اور کیسے ہو سکتی ہے، ہمیں ریسرچ نہیں کرنی تھی، اس گوہ کو مارنا تھا اور مارنا اس لیے نہیں تھا کہ یہ لوگوں پر حملے کرتی تھی بلکہ ہمیں لہو گرم رکھنے کا اِک بہانہ مل گیا تھا، ورنہ اس گوہ کے ساتھ ہماری کوئی خاندانی عداوت نہیں تھی۔ اس گوہ کو کُتّوں سے مروانا تھا اور اپنے آپ کو اپنی ماؤں سے بچانا تھا۔ میں اور میرے دو دوست جن کی شادیاں ہو چکی تھیں، گوہ کی نسبت اپنی ساسوں اور ماؤں سے زیادہ ڈرتے تھے۔

جب یہ آدمی ہمیں اس گوہ کی واردا تیں سنا رہا تھا تو ہمارے ایک بزرگ نے ہمیں کہا — "اوئے لڑکو! یہ تمہارا کام ہے۔ یہ گوہ ایک دو کتوں سے مرنے والی نہیں۔ سارے کُتّے لے جاؤ اور کلہاڑیاں بھی ساتھ رکھنا۔"

"ماؤں کو پتہ نہ چلنے دینا" — میرے تایا بولے — "چپکے سے نکل جانا۔ کہنا اگلی کسّی (برساتی نالہ) تک چلے ہیں۔"

اگلی ہی صبح ہم "اگلی کسّی" کی طرف چل پڑے۔ ہمارے ساتھ نو کُتّے، بارہ لڑکے، سات کلہاڑیاں اور پانچ لاٹھیاں تھیں جن کے اگلے سروں میں سیسہ بھرا ہُوا تھا۔ اس لاٹھی کی ایک ہی ضرب قوی ہیکل آدمی کو گرا دیتی تھی۔

میں نے جب بوقتِ رخصت اپنی ماں کے ماتھے پر گھور دیکھ کر کہا کہ ذرا اگلی کسّی تک جا رہے ہیں، جلدی آجائیں گے تو ماں نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا — "تو آ واپس، میں نے تجھے پچھلی کسّی تک نہ پہنچا دیا تو میرا نام بدل دینا۔"

میرے والد صاحب کھڑکی کے قریب کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ یہ اُن کی عادت تھی کہ مُسکراتے ہوئے میری ماں پر نظر رکھتے تھے۔ وہ جب اُن کی طرف دیکھتی تھی تو والد صاحب مداریوں کی طرح فوراً مسکراہٹ غائب اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر لیا کرتے تھے مگر اُس روز انہوں نے میری ماں پر نظر نہ رکھی اور مسکراتے ہوئے عین موقع پر پکڑے گئے۔

"نکال دانت" — ماں نے میرے والد صاحب سے کہا — "تو نکال لے دانت۔ تو حلالی ہوتا تو تیرا بیٹا بھی حلالیوں والے کام کرتا۔ اس کی شادی کسی کُتیا کے

ساتھ کر دیتی تو اچھا تھا۔ وہ اس کے کتوں سے جنتی رہتی۔"

"اوئے صابو!" ۔۔۔ والد صاحب نے غصّے سے کہا "جا دفع ہو جا یہاں سے۔ اگر دوبارہ آیا تو ....." والد صاحب کے غصّے میں ملاوٹ تھی۔ یہ سراسر جعل سازی تھی۔

"خالہ! کیوں مغز کھپا رہی ہو" ۔۔۔ میری دُلہن نے کہا ۔۔۔ "یہ باز آنے والی نسل سے نہیں۔ اتنی باتیں اس کے کُتے سے کہتیں تو وہ غیرت میں آکر اپنے ڈربے میں جا بیٹھتا۔"

آج میں ڈربے میں بیٹھ گیا ہوں۔ اس ماں کو، اس باپ کو اور اس دُلہن کو یادوں میں اور تصوروں میں زندہ رکھے ہوئے ہوں۔

ہماری شکاری پارٹی تین "اکلی کسیاں" پار کر کے گوہ والے نشیب میں پہنچ گئی۔ ہم ذہنی طور پر تیار تھے کہ ایک دو کُتے قربان کرنے پڑیں گے اور دو چار ساتھی زخمی بھی ہوں گے لیکن ہمیں امید تھی کہ دو کُتے گوہ کو مار لیں گے۔ ہم نشیب کے اُوپر کھڑے تھے تو ساتھ والے گاؤں میں خبر پہنچ گئی۔ گاؤں کی آدھی سے زیادہ آبادی ہمارے پاس آگئی۔ اس آبادی کے ساتھ ایک لڑنے والا بُوہلی کتا اور دو شکاری بُل ٹیریر بھی آئے ۔۔۔ اور ایک آدمی اپنی کُتیا بھی لے آیا۔ بڑی اچھی نسل کی خوبصورت کُتیا تھی۔ ہم نے کتوں اور کُتیا کے مالکوں سے کہا کہ جب ہم گوہ پر کُتے چھوڑیں تو وہ اپنے کُتوں کو زنجیروں میں رکھیں کیونکہ ہمارے اور ان کے کُتوں کا آپس میں تعارف نہیں۔ اگر شکار کے وقت انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بڑا خطرناک ہوگا۔

کتوں کے مالک غیور پوٹھوہاری تھے۔ وہ سمجھے کہ ہم نے ان کے کُتوں کو کمزور سمجھا ہے۔ ایک نے کہا کہ مجھے تمہارے کُتوں میں سے ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جو میرے کُتے کے آگے ٹھہر جائے۔ آؤ، شکار سے پہلے ہی آزما لو۔ دوسرے کتوں کے مالکوں نے اُس کی تائید کر دی۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارا مطلب کیا ہے لیکن بُوہلی کُتے کے مالک کی دُم پر پاؤں بڑی زور سے پڑا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ پہلے یہ فیصلہ کر لو کہ کُتے کس کے طاقتور اور خونخوار ہیں۔

پوٹھوہاری انگریز کے اتنے پکّے نہ ہوتے اور صلح صفائی کی بات اتنی جلدی سمجھ جانے والے ہوتے تو انگریز انہیں فوج میں بھرتی نہ کرتے۔ پاکستان کی آدھی فوج پوٹھوہاری ہے۔ پوٹھوہار نے تین نشانِ حیدر پیدا کیے ہیں۔

کُتیا کے مالک نے حماقت کی یا شاید وہ اپنی کُتیا کے حُسن کی نمائش کرنا چاہتا تھا، اُس نے اپنی کُتیا کی زنجیر کھول دی۔ کُتیا نے پہلے تو ہمارے دوست افضل کے بُوہلی کو جس کا میری کہانیوں میں کئی بار ذکر آیا ہے، دیکھا اور اس کی طرف آئی۔ میرے دو تین دوست اس گاؤں کے کُتوں کے مالکان کے ساتھ صلح صفائی کی باتیں کر رہے تھے۔ اُن کا بھی بُوہلی کُتا تھا جس کی بے عزتی اس کا مالک برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اِس بُوہلی کُتے نے اپنے گاؤں کی کُتیا کو افضل کے بوہلی کی طرف جاتے دیکھا تو وہ غصّے سے غرّایا۔ یہ بُوہلی غیرت مند معلوم ہوتا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا کہ اُس کے گاؤں کی کُتیا غیر کُتے کے پاس جائے۔

کُتیا نے رُک کر اُس کی طرف دیکھا اور کھسیانی سی ہو کر اُس کی طرف چل پڑی۔ افضل کے بُوہلی کو اُس بُوہلی پر غصّہ آگیا کہ تم کون ہوتے ہو اسے میرے پاس آنے سے روکنے والے؟ اتفاق سے اس کی زنجیر میرے ایک اور دوست کے ہاتھ میں تھی جو اُس نے ڈھیلی سی پکڑی ہوئی تھی۔ کُتیا اپنے گاؤں کے بُوہلی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور ندامت سے اُس کے منہ کے ساتھ منہ لگا لیا۔ افضل کے بُوہلی کا غصّہ اور بڑھ گیا۔ وہ غرّایا کہ سرِعام یہ نازیبا حرکت! ..... اُدھر وہ بُوہلی غرّایا کہ ہمارے بڑے پرانے مراسم ہیں تم کہاں سے آن ٹپکے ہو۔

افضل کے بُوہلی نے جست لگائی اور زنجیر چھُڑا کر اُس بُوہلی پر جا پڑا۔ اُس کے مالک نے اپنے بُوہلی کی زنجیر کھول دی۔ ہمارا بُوہلی اپنی ٹیم کا لیڈر تھا۔ ہمارے تمام کُتے اُس کی مدد کو پہنچنے کے لیے بھونکنے اور زنجیریں چھُڑانے لگے۔ اُس بُوہلی کا مالک دراصل اُس کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا۔ گوہ کا شکار الگ رہا، لوگ کُتوں کی لڑائی دیکھنے لگے۔ اُس دور میں کُتوں کی لڑائی کا بہت رواج تھا۔ اس کے شوقین لڑنے والے بہت قیمتی کُتے پالا کرتے تھے۔

ہمارے بُوہلی نے شاید جان لیا تھا کہ اُس کے گاؤں کی اور ہماری عزت

اور وقار کا سوال ہے۔ اُس کا مقابلہ بالکل اپنے جیسے کُتے کے ساتھ تھا۔ ظاہر ہوتا تھا جیسے ہمارا بُوہلی اُس کُتے سے ڈر رہا ہے۔ اُس کے گاؤں والے اُچھل اُچھل کر ہمیں شرمسار کر رہے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارا بُوہلی کس داؤ پر ہے۔ یہ اُس کا مخصوص اور مہلک داؤ تھا۔ جونہی اُسے موقع ملا اُس نے ایک سیکنڈ انتظار نہ کیا۔ اُس کُتے کے ایک پہلو کی طرف ہو کر اُس نے اُس بُوہلی کی گردن اُوپر سے اپنے منہ میں لے لی۔ یہ شیر اور چیتے کا داؤ ہوتا ہے۔ چھوٹا سا چیتا گھوڑے کی گردن اسی طرح پکڑتا ہے اور دو تین جھٹکے دے کر گردن کو کندھوں سے ملانے والی ہڈی کا ایک جوڑ کھول دیتا ہے۔ گھوڑا ہو، بیل ہو، بھینسا ہو، گردن کی ہڈی ٹوٹنے سے گر پڑتا ہے اور چلنے کے قابل نہیں رہتا۔

ہمارے بُوہلی نے یہ داؤ خود ہی سیکھ لیا تھا۔ یہی اُس نے اس بُوہلی پر چلایا اور اُسے گرا لیا۔ وہ بُوہلی اب تڑپ رہا تھا۔ ہولناک چیخیں مار رہا تھا اور ہمارا بُوہلی اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اُس کے مالک کو معلوم نہیں تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے کتے کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چھڑا دیتے ہیں لیکن وہ شکست تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ اُس کا بُوہلی خاموش ہو گیا اور اُس کا منہ کھل گیا۔ ہمارا بُوہلی اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اُس کی گردن پر گوشت اور چربی زیادہ تھی ورنہ اب تک اُس کی گردن ٹوٹ چکی ہوتی۔ وہ بھی طاقتور کُتا تھا۔ اُس نے اتنا زور لگایا کہ پیٹھ کے بل ہو گیا اور اپنی گردن چھڑا کر وہ نہایت تیزی سے اُٹھا اور بھاگ نکلا لیکن کچھ دور جا کر گر پڑا۔ وہ اُٹھا مگر اُس کا منہ زمین سے نہ اُٹھا۔ وہ وہیں گھومنے لگا۔ اُس کی گردن ٹوٹ گئی تھی ——— اور اُس کے مالک کی گردن جھک گئی۔

ہمارا بُوہلی پھر اُس پر جا پڑا تھا۔ زنجیر اُس کے پٹے میں تھی۔ افضل نے زنجیر پکڑ لی۔ دو لڑکوں نے اس کی پچھلی ٹانگیں پکڑ لیں ورنہ وہ اُس کتے کو جان سے مار ڈالتا۔ اس کُتے کا مالک تین چار آدمیوں کی مدد سے اپنے کُتے کو اُٹھا کر لے گیا۔ دوسرے دونوں کُتوں کے مالکوں اور کُتیا والے سے ہم نے کہا کہ وہ انہیں زنجیروں میں رکھیں۔ اب وہ ہماری بات سمجھ گئے تھے۔

ہم نے لوگوں سے گوہ کے متعلق پوچھا کہ کس وقت باہر آتی ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ایسے ہوتا ہے کہ کسی انسان یا جانور کے قدموں کی آہٹ سنتی ہے تو باہر آ جاتی ہے۔ اس نشیب سے اُوپر کبھی نہیں آئی۔ وہ اس گہری جگہ کو اپنی بادشاہی بنائے ہُوئے تھی۔ ان معلومات کے مطابق ہم اسے مارنے کی سکیم تیار کرنے لگے۔ میں آپ کو پہلے بھی کبھی بتا چکا ہوں کہ ہمیں لوگ صرف اس لیے شکاری کہتے تھے کہ ہم شکار کھیلا کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم میں شکار کھیلنے والی عقل اور ذہانت نہیں تھی۔ ہمارے کُتے شکار کو دیکھ کر اُس کے پیچھے دوڑ پڑتے اور ہم کُتوں کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے۔ ان میں اور ہم میں فرق یہ تھا کہ وہ بھونکتے تھے اور ہم باتیں کرتے تھے۔ وہ شکار کو مار کر کھا لیتے اور ہم دیکھا کرتے تھے۔

ہم شکار کے اصولوں اور طور طریقوں سے واقف نہیں تھے۔ لہٰذا ہماری سکیمیں اور ان پر عمل حالات کے مطابق ہوتا تھا البتہ اس گوہ کو مارنے کی سکیم میں ہم نے سوچا کہ نو کُتے اور بارہ لڑکے ایک ہی بار نیچے چلے گئے تو گوہ سامنے نہیں آئے گی۔ آخر گوہ میں تھوڑی بہت عقل تو ضرور ہو گی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ صرف ایک لڑکا ایک کُتے کو ساتھ لے کر نیچے جائے۔ باقی سب اُوپر تیار رہیں۔ گوہ نکلے تو یہ لڑکا کُتے کے ساتھ بھاگ اُٹھے تاکہ گوہ اپنے بِل سے دُور آ جائے۔ ہم اُس کی واپسی کا راستہ بند کرنے کی سوچ رہے تھے۔

ہمارا ایک ساتھی اپنے کُتے کے ساتھ نیچے چلا گیا۔ گوہ کی جو جگہ بتائی گئی تھی وہ نشیب کے سامنے والے کنارے کے درمیان میں تھی۔ ہمارا ساتھی اُس جگہ سے ذرا دُور جا کر رُک گیا۔ فائدہ یہ تھا کہ نشیب میں گھاس اور جھاڑیاں نہیں تھیں۔ چند ایک درخت تھے۔ ہمارا ساتھی گوہ کے بِل کے قریب چلا گیا۔ ہم سب اُوپر دم بخود کھڑے تھے۔ تماشائیوں سے ہم نے کہا کہ سب بیٹھ جائیں، ورنہ گوہ ڈر کر سامنے نہیں آئے گی۔

ہمارا ساتھی اور آگے گیا مگر گوہ سامنے نہ آئی۔ ہم میں سے کسی نے چلّا کر کہا۔ ”دائیں دیکھ اوئے!“ ——— گوہ دائیں طرف سے کہیں سے نکلی تھی۔ ہمارا ساتھی اس سے بے خبر تھا۔ اُس نے للکار پر چونک کر دیکھا اور اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔

گوہ رک گئی تھی۔ وہ شاید حملے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہم کہتے تھے کہ گوہ اتنی بڑی نہیں ہو سکتی جتنی لوگ بتاتے ہیں۔ لوگوں کی عادت تھی کہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتے تھے لیکن یہ گوہ اُس سے کچھ زیادہ ہی بڑی تھی جتنی ہمیں بتائی گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت گوہ جیسی تھی لیکن یہ کوئی عفریت تھا۔ انگریزی میں اسے آپ ڈریگن کہہ سکتے ہیں۔ یہ میرے اندازے کے مطابق نارمل سائز کی گوہ سے اڑھائی گنا بڑی تھی۔

یہ جب ہمارے ساتھی کی طرف دوڑی تو میں اس کی رفتار دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہمارا ساتھی قدموں کا بہت تیز تھا پھر بھی ہمیں وہ خطرے میں نظر آیا۔ ہم نے اپنے کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں الگ کیں اور ان کی توجہ شکار کی طرف کر کے انہیں چھوڑ دیا۔ اس طرف کا کنارا ڈھلانی تھا۔ کُتے بھونکتے ہوئے ادھر سے اُترے ہم بھی کودتے پھلانگتے اُتر گئے۔ گوہ نے اتنے سارے کتوں کو دیکھا تو مقابلے میں ڈٹ گئی۔ وہ ایک کُتے کی طرف دوڑی۔ بیک وقت دو کتوں نے پہلو کی طرف سے اُس پر حملہ کیا اور اُس کے اُوپر سے گزر گئے۔ گوہ دوسرے پہلو کی طرف لڑھک گئی مگر سنبھل گئی۔

ایک ہی بار باقی کُتے اُس پر جھپٹے تو اُس کی دُم حرکت میں آگئی۔ جس کُتے پر یہ دُم پڑی وہ بلبلا اُٹھا اور ہماری ٹانگوں میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ افضل کے بُوہلی نے گوہ کی پچھلی ٹانگ منہ میں لے لی۔ گوہ نے دُم گھما کر ہنٹر کی طرح ماری تو یہ بُوہلی کی بجائے ایک اور کُتے کو لگی۔ وہ پرے جا پڑا اور چیختا چلاتا ہمارے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ گوہ کو کلہاڑیوں سے نہیں ماریں گے۔

ہمیں اُمید تھی کہ بُوہلی گوہ کے پہلو سے اس کا پیٹ پھاڑ ڈالے گا لیکن گوہ نے سانپ کی طرح منہ پیچھے کر کے بُوہلی کی پچھلی ٹانگ منہ میں لے لی۔ گوہ کے دانت تیز ہوتے ہیں۔ بُوہلی جیسا طاقتور کُتا تڑپ کر اس سے الگ ہو گیا لیکن گوہ خواہ کتنی ہی بڑی تھی اکیلی تھی۔ اس نے بُوہلی کی ٹانگ منہ میں لی تو ایک کُتے نے اُس کی گردن اپنے منہ میں لے لی۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے اور تماشہ دیکھنے لگے۔ کُتے اُس کی دُم سے ڈرتے تھے اور اُس کی دُم مسلسل چل رہی تھی۔ وہ بھاگنے کی کوشش

ہی نہیں کر رہی تھی۔ کُتوں کے درمیان تیزی سے دوڑتی پینترے بدلتی اور دُم چلاتی تھی۔ جس جس کُتے کو اُس نے منہ ڈالا تھا، وہ لہولہان ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے جسم سے خُون بہہ رہا تھا۔

اُس کی طاقت اور دلیری اور پھُرتی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے کُتوں کا دائرہ کھُلا کر دیا اور اس دائرے میں گھومتی اور کسی نہ کسی کُتے پر حملہ کرتی تھی مگر دوسرے کُتے اُس کا حملہ بیکار کر دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد اُس کی دُم کے زناٹے کمزور ہونے لگے۔ کُتوں نے اُس پر جھپٹ جھپٹ کر اُس کے پہلوؤں سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ اس کی رفتار سُست ہو گئی، پھر وہ ایک جگہ رک کر کُتوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ آخر بے حال ہو گئی۔ ہم نے کُتوں کو بڑی مشکل سے زنجیریں ڈالیں۔ گوہ ابھی مری نہیں تھی، مر رہی تھی۔ اس کی دُم آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔

وہ ایک بار زور سے تڑپی اور مر گئی۔ ہم نے اُس کی دُم پکڑی اور اسے گھسیٹتے ہُوئے اُوپر لے گئے۔ ہم واپس چلنا چاہتے تھے لیکن گاؤں والے ہمیں اپنے گاؤں لے گئے اور ہماری خوب خاطر تواضع کی۔

یہ تو ہے شکار کی کہانی۔ واپسی پر ایک اور کہانی ہو گئی۔ یہ انسانی فطرت کا قصہ ہے۔ ہم گوہ کو اس طرح اُٹھائے ہوئے واپس آ رہے تھے کہ چار لڑکوں نے اس کی ایک ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی اور دو نے دُم جسم کے قریب سے پکڑ رکھی تھی۔ اِس کا وزن بیس سیر سے زیادہ ہو گا۔ ہم نے واپسی کا آدھا راستہ طے کیا ہو گا کہ ہمیں ایک عورت سر پر چھوٹی سی گٹھڑی رکھے اکیلی جاتی نظر آئی۔ ہم اُس سے ذرا دُور تھے۔ ایک درخت کے نیچے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ وہ اس عورت کو آتے دیکھ کر اُٹھا اور عورت اُس کے پاس جا کر رُک گئی۔ ہمارے آگے راستہ نیچے جاتا تھا۔ ہم نیچے گئے تو وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہمارے ساتھ تین چار لڑکے خطرناک حد تک شرارتی تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ اوپر جا کر چھُپ کر دیکھے گا کہ یہ آدمی اور عورت کیا کرتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ عورت اس آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ رہی ہے۔ یہ آدمی اس

کا آشنا ہے اور اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ہم وہیں رُک گئے اور دولڑکے ڈھلان پر چڑھ کر لیٹ گئے۔ اِن کے آگے جھاڑیاں تھیں۔ وہ تھوڑی دیر دیکھتے رہے، پھر نیچے آ گئے۔

"یہ تو حسنو ہے"۔۔۔ انہوں نے نیچے آکر بتایا۔"وہ چلی گئی ہے اور وہ آدمی وہیں کھڑا ہے۔ لوگ حسنو کو شریف عورت سمجھتے تھے لیکن اس نے خفیہ آشنائی پیدا کر رکھی ہے"۔

حسنو ہمارے گاؤں سے تین میل کے لگ بھگ دُور ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اُس وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی۔ پانچ سال پہلے وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس وقت اُس کا دو سال کا ایک بچہ تھا۔ وہ بڑی خوبصورت عورت تھی۔ اس عورت کو ہم چھ سال پہلے تک نہیں جانتے تھے۔ وہ دوسرے گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کے تو ہم نام سے بھی واقف نہیں تھے لیکن ایک روز سارا علاقہ حسنو کے نام سے واقف ہو گیا۔ یہ چھ سات سال پہلے کا واقعہ تھا۔ ہمیں اس واقعہ کی جو تفصیل ملی تھی وہ اس طرح تھی کہ حسنو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کی ماں دو سال پہلے مر گئی تھی۔ اس کے بعد باپ بھی مر گیا۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جو بنگال پولیس میں بھرتی ہو کر بنگال چلا گیا تھا۔ صرف ایک بار دس پندرہ دنوں کی چھٹی آیا تھا۔ اس کے بعد نہ اُس کا خط آیا نہ وہ خود آیا۔ اُس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ اُس نے ایک بنگالن کے ساتھ شادی کر لی تھی اور وہیں کا ہو کے رہ گیا تھا۔

حسنو اپنے دو سال کے بچے کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ گاؤں میں خوبصورت اور جوان لڑکی بیوہ اور بے آسرا ہو جائے تو امیدواروں کی قطار لگ جاتی ہے۔ حسنو اُونچی ذات کی تو نہیں تھی لیکن نیچ ذات کی بھی نہیں تھی۔ اُس کے ماں باپ کی زمین اُس کے پاس تھی اور اُس کے خاوند نے باپ سے زمین کا حصہ الگ کرا لیا تھا۔ یہ کھیت بھی حسنو کے پاس تھے۔ ہمارا علاقہ ہے تو بارانی اور کھیتیاں اُونچی نیچی ہیں لیکن اُس زمانے میں جب ابھی مصنوعی کھاد ایجاد نہیں ہوئی تھی یہ کھیتیاں بہت اناج دیتی تھیں۔ دالیں اور فالتو گندم منڈی میں چلی جاتی اور

باقی اپنے کام آتی تھی۔

اس لحاظ سے حسنو امیر زمیندار تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ گرمیوں کی ایک رات جب لوگ چھتوں پر سوتے تھے، حسنو کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ اپنی چھت پر اپنے بچے کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اُس کا مکان پتھروں کا تھا۔ ہمارے علاقے میں بڑے اچھے پتھر مِل جایا کرتے تھے اور بیشتر مکان پتھروں کی دیواروں کے بنتے تھے۔ حسنو کو شک ہُوا جیسے مکان کے پچھواڑے سے اور اندر کوئی آہٹ ہے۔ چاند پورا تھا۔ اُس زمانے میں ڈاکو نقب لگایا کرتے تھے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ نقب کیا ہوتی ہے۔ "پچھواڑے کی دیوار سے زمین کے ساتھ اینٹیں یا پتھر نکال کر اتنا راستہ بنا لیا جاتا تھا جس میں سے ایک آدمی اور ٹرنک گزر سکتے تھے"۔ نقب وہی ڈاکو لگاتے تھے جو نقب لگانے کے ماہر ہوتے تھے۔ ہر ڈاکو نقب زنی نہیں کر سکتا تھا۔ چوروں کو جو مراعات آج حاصل ہیں وہ اُس زمانے میں نہیں ہوتی تھیں اس لیے چور گرفتاری سے بچنے کے لیے اُستادی طریقے اختیار کرتے تھے۔

حسنو کے گھر میں روپیہ پیسہ تھا اور زیور بھی تھا اس لیے اُسے چوری، ڈکیتی اور نقب زنی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اُس نے رات کو پچھواڑے اور چھت کے نیچے آہٹ سی سنی تو اُس نے پچھواڑے کی منڈیر سے نیچے دیکھا۔ چاندنی صاف تھی۔ اُسے دو انسانی ٹانگیں نظر آئیں جو اندر جا رہی تھیں۔ اس انسان کا باقی جسم اندر چلا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اندر جا رہا تھا۔ وہاں چند ایک دیواری پتھر پڑے ہوئے تھے۔ حسنو سمجھ گئی کہ نقب لگی ہے اور یہ آدمی اندر چلا گیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آدمی اکیلا نہیں ہو سکتا۔ نقب زنی ایک آدمی کا کام نہیں ہوتا تھا۔

حسنو اکیلی تھی۔ اُس نے شور مچانا ٹھیک نہ سمجھا کیونکہ لوگوں کے جاگنے اور پہنچنے تک ڈاکو بھاگ چکے ہوتے۔ اُس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اُسے ایک ہتھیار اور ایک طریقہ نظر آ گیا۔ ہمارے علاقے میں سِلّیں بہت ہوتی ہیں۔ کئی علاقوں میں سِلوں کی چٹانیں ہیں۔ یہ سِلّیں مکانوں کی تعمیر میں

اِس طرح استعمال ہوتی تھیں کہ کمرے کی چھت ڈال کر دیوار پر سلیں اس طرح رکھی جاتی تھیں کہ ان کا کچھ حصہ باہر کی طرف رہتا تھا۔ اِن کے اوپر باقی چھت کو مٹی وغیرہ ڈال کر مکمل کیا جاتا تھا۔ ایک سِل پندرہ بیس سیر وزنی ہوتی تھی۔

حسنو نے منڈیر سے ایک سِل اکھاڑ لی۔ یہ کہنا آسان ہے کہ اُس نے سِل اکھاڑ لی۔ چھت میں جمی ہوئی اور چھت کی بڑی ہی موٹی تہہ میں دبی ہوئی سِل کو اُکھاڑنا ایک عورت کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اتنی وزنی سِل کو اکھاڑنا اور پھر اُسے سنبھال کر رکھنا اور زیادہ مشکل تھا۔ اُس نے سِل کو منڈیر پر عین اُس جگہ کے اُوپر سیدھا رکھ لیا جہاں نیچے ایک آدمی اندر چلا گیا تھا۔ سِل اکھاڑنے سے منڈیر کی بہت سی مٹی نیچے گری۔ نقب زن ابھی اندر تھے۔ وہ ایک ہی بار باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ حسنو نیچے دیکھ رہی تھی۔

اُسے ایک آدمی کا سر باہر آتا نظر آیا۔ اُس نے سِل جو بیس سیر سے کچھ زیادہ وزنی تھی نیچے کو سرکا دی۔ اتنی اُوپر سے اتنی وزنی سِل اس آدمی کی گردن پر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی حسنو نے شور مچا دیا۔ ڈاکوؤں کے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ نقب میں ان کا ساتھی بے ہوش پڑا تھا۔ وہ دروازے سے صحن کی طرف نکل سکتے تھے لیکن حسنو دروازے کو باہر سے مقفل کر کے رات چھت پر جایا کرتی تھی۔

جب لوگ لاٹھیاں کلہاڑیاں اٹھائے ہوئے پہنچے اُس وقت ڈاکو اپنے بے ہوش ساتھی کو نقب میں سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دروازہ کھول کر انہیں پکڑ لیا گیا۔ جس پر سِل گری تھی وہ بے ہوش تھا۔ سِل اُس کی گردن پر گری تھی اور گردن کی ہڈی کچلی گئی تھی۔ اُسے مرنا تھا۔ اُسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

تھانہ دُور تھا۔ اُسی وقت گھوڑیوں پر دو آدمی تھانے گئے۔ تھانیدار ہندو تھا۔ وہ اپنی گارد لے کر فوراً پہنچ گیا۔ تینوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ تیسرا آدمی ہسپتال پہنچتے ہی مر گیا۔ یہ واقعہ معمولی نہیں تھا۔ ایک عورت نے ڈاکوؤں کو پکڑوایا تھا۔ دوسرے دن ہر طرف یہ خبر چلی گئی۔ ہم جتنے نوجوان دوست تھے بھاگم بھاگ حسنو کے گاؤں پہنچے۔ نقب لگی ہوئی دیکھی۔ وہاں تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ہم حسنو کو

دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ تھانے گئی ہوئی تھی۔

اُس گاؤں کے دو لڑکے ہمارے دوست تھے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک تو انہوں نے یہ سنایا کہ حسنو نے ڈاکوؤں کو کس طرح پکڑوایا ہے، پھر انہوں نے حسنو کے کردار اور اخلاق کی باتیں سنائیں جو مختصراً اس طرح ہیں کہ حسنو بڑی اچھی طبیعت کی عورت تھی۔ ہنسنا کھیلنا بھی جانتی تھی اور اُسے رونا بھی آتا تھا۔ اُس کا خاوند مر گیا تو دو قسم کے آدمی اُس کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ ایک وہ جو اُس کے ساتھ شادی کے خواہشمند تھے اور دوسرے وہ جو حسنو کے ساتھ چوری چھپے والی دوستی لگانا چاہتے تھے لیکن حسنو نے سب کی امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔

اُس کی توجہ اپنے خاوند کی قبر پر اور اپنے بچے پر لگی رہتی تھی۔ نقب زنی تک اُسے بیوہ ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے۔ بیوگی کے پہلے ایک سال تک وہ ہر روز خاوند کی قبر پر جاتی تھی۔ اُس نے قبر پکّی کرائی اور شہر سے پھولدار ٹائیلیں منگوا کر قبر میں لگوائیں۔ وہ تیسرے چوتھے دن پانی کا گھڑا سر پر لے جا کر قبر کو دھوتی تھی۔ ایک سال کے بعد اُس نے ہر جمعرات قبر پر جانا شروع کر دیا۔ ہر جمعرات وہ قبر پر دیا جلاتی تھی۔

وہ کسی کی محتاج نہیں تھی۔ اُس نے اپنی زمینیں بٹائی پر دے رکھی تھیں اور خود نگرانی کرتی تھی۔ اُس کے سسرال والے اُس کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اُن کی تو اُس نے یوں عزت سنبھال کر رکھی ہوئی تھی کہ اُن کے بیٹے کے مرنے کے بعد اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ان پانچ سالوں میں اُس نے تمام امیدواروں کو مایوس کر دیا تھا۔ ان میں ایک امیدوار کسی دوسرے ضلعے کا بہت بڑا زمیندار تھا جس کی دو تین مربعے نہری زمین بھی تھی۔ اُس نے یا اُس کے کسی آدمی نے حسنو کو دیکھا تھا۔

حسنو کے اپنے گاؤں کے دو آدمی جو امیر کبیر تھے اور اُونچی ذات کے تھے، حسنو کو دوستی کے پیغام تحفوں کے ساتھ بھیجتے رہے تھے لیکن حسنو نے انہیں پہلے ہنس مسکرا کر ٹالا پھر عورتوں کی ایک محفل میں اُس نے اُس عورت کی بے عزتی کر دی تھی جو ان آدمیوں کے پیغام لایا کرتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ ان دونوں سے

کہہ دینا کہ سارے گاؤں کے سامنے اُن کی بے عزتی کروں گی۔

میں سمجھ گیا کہ اس عورت میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ اُس نے خطرے میں اپنی عقل کو ٹھکانے رکھا اور اتنی وزنی سِل اکھاڑ کر اور اسے سنبھال کر عین نشانے پر پھینکا تھا۔ یہ طاقت کردار کی تھی۔ مجھے یہ کہاوت سچی معلوم ہونے لگی کہ عورت اگر اپنے خاوند کی موت کے بعد بھی اُس کی وفادار رہے تو اُس میں اپنی طاقت کے علاوہ خاوند کی طاقت بھی آجاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مرد ہو یا عورت اخلاق، چال چلن اور خیالات پاک صاف رہیں تو اُس میں خدا بہت ساری فالتو طاقت بھر دیتا ہے جو بوقتِ ضرورت کام آتی ہے۔

ہم جب حسنو کی باتیں سُن کر وہاں سے آنے لگے تو کسی نے بتایا کہ حسنو تھانے سے واپس آرہی ہے۔ ہم نے اُسے راستے میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ ویسے تو وہ خوبصورت ہی تھی لیکن اُس کے چہرے پر پاکیزگی اور فتح کا جو تاثر تھا اس نے اُس کے حسن کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ اُس کے ساتھ گاؤں کے تین چار آدمی تھے۔ ہم نے حسنو کو روک کر مبارک دی اور کہا کہ اُس نے مردوں والی بہادری دکھائی ہے۔ وہ مسکرائی اور بولی ــــ "بھلا ہو تمہارا ویرا جو کیا میرے اللہ نے کیا ہے"۔

اُس زمانے میں عدالتوں میں مقدمے سالوں کے حساب سے نہیں ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے چلتے تھے۔ دونوں ڈاکوؤں کو پانچ پانچ سال سزائے قید تیسرے مہینے مل گئی۔ اُس زمانے میں سزائے قید صحیح معنوں میں سزا ہوتی تھی۔ سارا سارا دن چکّی پسواتے اور رہٹ کے ساتھ بیلوں کی بجائے قیدیوں کو جوتا کرتے تھے۔ قیدی جب جیل سے نکلتا تھا تو اُسے ایک کے چار نظر آتے تھے۔

اس کے بعد ہم نے تین چار مرتبہ حسنو کو دیکھا۔ دو مرتبہ ہم دو دوست صرف اُسے دیکھنے کے لیے اُس کے گاؤں گئے، پھر یہ واقعہ پرانا ہونے لگا۔ اُس کے متعلق ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ بیوگی کاٹ رہی ہے تو حسنو کاٹ رہی ہے۔ بعض کہتے تھے کہ حسنو کا پیر کامل ہے لیکن کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ اُس کا پیر کون ہے۔ وہ اداس بھی نہیں رہتی تھی۔ خوش باش عورت تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اُس کی دوستی کے امیدواروں نے چوری چھپے اُس پر نظر

رکھی تھی کہ وہ نہایت خفیہ طریقے سے کسی کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے ہے لیکن انہیں حسنو کا کوئی دوست نظر نہ آیا۔

اب اُس کی عمر کم و بیش تیس سال ہو گئی تھی جب ہم اُسے ایک آدمی کے ساتھ گاؤں سے اتنی دُور غیر آباد اور کھڈ نالوں کے علاقے میں دیکھ رہے تھے۔ ہم گہرائی میں تھے۔ گوہ کو ہم نے رکھ دیا تھا۔ ہمارے دو ساتھیوں نے اُوپر جا کر چھُپ کر دیکھا اور نیچے آکر بتایا کہ وہ حسنو ہے اور اس آدمی کے ساتھ باتیں کر کے چلی گئی ہے اور وہ آدمی درخت کے نیچے بیٹھ گیا ہے۔ ہم نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ دے دیا کہ یہ ہے حسنو کا خفیہ دوست۔ اُس وقت حسنو کا بچہ سات سال کا ہو چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس بچے کی خاطر تو وہ جی رہی تھی۔ اگر وہ کہیں اور گئی تھی تو اپنے بچے کو ساتھ کیوں نہ لے گئی؟ ہم نے سُنا تھا کہ بچے سے تو وہ جدا ہوتی ہی نہیں۔ بچے کو ساتھ نہ لانے کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس آدمی کے پاس آئی تھی۔ میرے تین چار ساتھیوں نے کہا کہ یہ دونوں پہلے کسی ڈھکی چھُپی جگہ اکٹھے رہے ہیں۔ آدمی وہاں سے پہلے نکل آیا پھر حسنو کسی اور طرف سے باہر آئی۔

ہم سب گوہ کو اٹھا کر اُوپر چلے گئے۔ ہم نے طے کیا تھا کہ اس آدمی کے پاس سستانے کے لیے بیٹھیں گے۔ اس کے ساتھ گپ شپ لگائیں گے اور حسنو کی بات چھیڑ دیں گے۔ ہمیں اُس کے بُرا منانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ وہ اکیلا اور ہم پوری درجن تھے۔ ہم اُس سے باز پُرس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے اور کیا اُس کے واقعی حسنو کے ساتھ تعلقات ہیں؟

ہمیں دیکھ کر اس آدمی نے پگڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ آنکھیں سُرخ تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ رو رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر مسکرایا، پھر گوہ کو دیکھ کر حیران ہُوا اور اس کے متعلق باتیں کرنے اور ہماری سننے لگا۔ اُس کی عمر حسنو جتنی تھی۔ یہی کوئی تیس اکتیس سال۔ اُس کا رنگ گندمی تھا۔ چہرے میں مردانہ کشش تھی۔ نقش اچھے تھے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی جو سلیقے سے

تراشی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی یہ داڑھی نہ ہوتی تو اس کے چہرے میں اتنی کشش بھی نہ ہوتی۔ قد بُت بھی اچھا اور جسم پھرتیلا تھا۔

ہم اپنے ساتھ کھانے کے لیے انڈے اور پراٹھے لے گئے تھے۔ یہ ہم نے نہیں کھائے تھے کیونکہ ہمیں کھانا اُس گاؤں والوں نے کھلا دیا تھا جس کے قریب ہم نے گوہ ماری تھی۔ ہم نے اپنے پراٹھے وغیرہ اُس کے آگے رکھ دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا کہ لڑکو! تم نے میرا کام کر دیا ہے۔ میں تو بھوک سے مرا جا رہا تھا۔ ہم یہی چاہتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔ وہ خوش طبع آدمی تھا۔ ہماری کوشش کے بغیر ہی ہمارے ساتھ کھُل گیا۔

اُس کے ساتھ ہماری جو باتیں ہُوئیں وہ سب آپ کے کام کی نہیں میں صرف وہ بات سناؤں گا جس سے میری یہ کہانی مکمل ہوتی ہے۔ ہم گپ شپ، ہنسی مذاق اور باتوں باتوں میں اُسے حسنو کی طرف لے آئے اور اُس سے پوچھا کہ اس عورت کو وہ کس طرح جانتا ہے۔ حسنو اس کی رشتہ دار نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ وہ پوٹھوہاری نہیں بول رہا تھا۔ اُس کی زبان سرگودھا کے علاقے کی تھی۔

وہ حسنو کے متعلق کھُل کر بات نہیں کرتا تھا۔ ہمارے ایک دوست نے اُسے کہا کہ حسنو کی شرافت اور پاکیزگی مشہور ہے اور سب حیران ہیں کہ وہ بیوگی کس طرح گزار رہی ہے۔

" صاف بات ہے جی!" — میرے دوست شہباز نے کہا — "ہر کسی کو شک ہے کہ حسنو نے کسی کو خاوند تو نہیں بنایا لیکن اُس کی زندگی پاک صاف بھی نہیں گذر رہی۔ اُس نے کسی نہ کسی کے ساتھ خفیہ آشنائی کر رکھی ہے۔ آج ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اُس کی آشنائی کس کے ساتھ ہے"۔

وہ ہنستے مسکراتے سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اس عورت پر ایسا شک نہ کرنا ورنہ تمہیں اللہ کی ذات بخشے گی نہیں۔ ہم نے اُس کی اس بات کو رَد کر دیا اور اُسے کہا کہ حسنو ہماری کچھ نہیں لگتی۔ اگر اُس نے کسی کو درپردہ دوست بنا رکھا ہے تو ہمیں کیا۔ ہم صرف دلچسپی کی خاطر پوچھ رہے ہیں۔

" میری بات دھیان سے سننا!" — اُس نے کہا — "میں تمہاری طرح اعلیٰ خاندان اور ذات کا آدمی ہوں لیکن میں نے اپنے خاندان کا نام ڈبو دیا ہے۔ تم اپنے اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھنا ورنہ بہت بُری سزا پاؤ گے .... میں وہ ڈاکو ہوں جس نے حسنو کے گھر نقب لگائی تھی۔ میرا نام علی حیدر ہے۔ اُن دو آدمیوں کو میں اپنے ساتھ لایا تھا جن میں سے ایک حسنو کی پھینکی ہُوئی سِل کے نیچے آکر مر گیا تھا اور دوسرا میرے ساتھ پکڑا گیا تھا"۔

ہم یہ سُن کر حیران نہ ہوئے کیونکہ ہم اسے جھوٹ سمجھ رہے تھے کہ اس شخص نے حسنو کے مکان میں نقب لگائی تھی۔

" میں جھُوٹ نہیں بول سکتا" — اُس نے کہا — "حسنو کے سارے گاؤں نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے حوالات سے کچہری لے جایا گیا تھا۔ بہت سے لوگ جنہوں نے مجھے دیکھا تھا وہ اب بھی مجھے پہچان لیں گے۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ میں حسنو کی عزّت بچانے کے لیے تمہارے ساتھ یہ بات کر رہا ہوں۔ حسنو کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔ یہی اس کے ساتھ بات کی تھی"۔

اُس نے حسنو کے ساتھ اپنی اس ملاقات کا قصّہ یہ سنایا کہ وہ پیشہ ور ڈاکو نہیں۔ سرگودھا کے علاقے کے زمیندار مشہور ہیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ ان زمینداروں کے گھروں میں روپوں سے گھڑے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ایک زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ عیاش تھا۔ علی حیدر کے سات بھائی اور تین بہنیں تھیں جو دو بیویوں میں سے تھیں۔ اولاد بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل نکلی۔ علی حیدر نے صاف الفاظ میں بتایا کہ اُس کی بہنیں بھی بدکار تھیں۔ ایک کی شادی ہوئی تو بھی اُس نے یارانے نہ چھوڑے۔

علی حیدر بدی میں ایسا اندھا ہُوا کہ جرائم پیشہ لوگوں سے جا دوستانہ گانٹھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ اُس کا باپ مر گیا۔ بھائیوں اور بہنوں نے جائیداد تقسیم کر لی۔ ان میں اتفاق اور اتحاد پہلے ہی نہیں تھا، اب وہ ایک دوسرے کے

لیے غیر ہو گئے۔ علی حیدر اپنے خاندان سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ اُس کے بھائیوں نے اُس کے ساتھ دھوکہ کیا اور اُسے حصّہ اس کے حق سے تھوڑا دیا۔ علی حیدر نے پرواہ نہ کی۔

اُسے نامی گرامی ڈاکوؤں اور رہزنوں کے کارنامے اچھے لگتے تھے۔ شراب، چرس اور بدی نے اُس کی عقل مار ڈالی اور اُس نے ڈاکوؤں کا ایک گروہ بنا لیا جس میں پانچ آدمی تھے۔ ان میں ایک نقب زنی کا ماہر تھا۔ علی حیدر اس گروہ کا سردار تھا۔ اُس نے جہلم کے علاقے میں ڈکیتی کی دو وارداتیں اور شاید تین وارداتیں رہزنی کی کیں۔ ان وارداتوں سے اُسے بہت مال ملا۔ چونکہ وہ پکڑا نہیں گیا تھا اس لیے وہ اور اس کے ساتھی دلیر ہو گئے۔ انہوں نے الگ الگ وارداتیں بھی کیں۔

اُس نے یہ نہ بتایا کہ وہ ہمارے علاقے میں کیوں آیا اور یہاں کس نے اُسے اپنے پاس رکھا۔ کہتا تھا کہ وارداتیں کرنے والے ایسی باتیں کسی کو نہیں بتایا کرتے۔ اُس نے بتایا کہ حسنو کے گھر جو مال دولت تھا اس کی خبر ایک گھر بھیدی نے دی تھی۔ اُس نے گھر بھیدی کا نام نہ بتایا۔ یہ نام اُس نے پولیس کو بھی نہیں بتایا تھا۔ گھر بھیدی نے اُسے بتایا تھا کہ حسنو کے گھر میں رقم اور زیور کہاں پڑا ہے۔

وہ اپنے ساتھ دو آدمی لے کر آیا۔ ان میں وہی نقب زنی کا ماہر تھا جو حسنو کی سِل کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس شخص نے بڑی تیزی سے دیوار سے پتھر نکالے اور سب سے پہلے علی حیدر پھر اُس کا دوسرا ساتھی اندر گئے۔ نقب لگانے والا بعد میں گیا۔ یہ تو میں آپ کو سُنا چکا ہوں کہ وہ کس طرح پکڑے گئے تھے۔

علی حیدر نے سنایا کہ وہ آخر اُونچی ذات کے خاندان کا آدمی تھا اس لیے اُس کے دل میں اس عورت کی عزت پیدا ہو گئی جس نے گھبرانے اور شور مچانے کی بجائے اتنی وزنی سِل منڈیر سے اکھاڑ لی اور سب کو پکڑوا دیا۔ اُس نے حسنو کو اچھی طرح دیکھا۔ حسنو کو وہ مقدمے کے دوران کچہری میں بھی دیکھتا رہا۔ حسنو اُس کے دل میں اُتر گئی۔ علی حیدر جب تھانے میں تھا تو اُس نے تھانیدار سے

جو ہندو تھا، کہا کہ وہ اُسے اتنی رشوت دے گا جتنی وہ اپنے منہ سے مانگے گا، وہ اُسے بچا لے۔

تھانیدار نے اُس کے ساتھ سودا کر لیا لیکن اُس نے علی حیدر سے کہا کہ وہ مقدمہ گول نہیں کر سکتا۔ صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ حسنو شناخت پریڈ میں علی حیدر کو شناخت نہ کرے۔ تھانیدار نے گاؤں کے نمبردار کو تیار کر لیا تھا کہ وہ علی حیدر کی شناخت میں شک پیدا کر دے کہ یہ آدمی وہ نہیں۔ قانون میں یہ گنجائش ہے کہ گواہوں میں ذرا سا اختلاف پیدا ہو جائے تو ملزم کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا جاتا ہے۔

تھانیدار کو علی حیدر نے اتنی زیادہ رشوت دینے کا وعدہ کیا تھا کہ وہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے حسنو کو اس بہانے سے تھانے بلایا کہ اُس کے بیان میں کچھ کمی رہ گئی ہے وہ پوری کرنی ہے۔ حسنو تھانے گئی تو تھانیدار نے علی حیدر کو حوالات سے نکال کر حسنو کو اس کے سامنے بٹھا دیا اور خود بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ تھانیدار نے حسنو سے کہا کہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہُوا بلکہ تم نے علی حیدر کے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ تم علی حیدر کو بچا سکتی ہو۔ تھانیدار نے اُسے بتایا کہ وہ کیا کرے۔

حسنو نہ مانی۔ علی حیدر نے حسنو سے کہا کہ اُس سے یہ کام مفت نہیں کرایا جا رہا۔ علی حیدر اُسے سونے کے زیورات دے گا اور وہ جتنی رقم مانگے وہ بھی دے گا۔

"مجھے خدا نے طاقت اور عقل دی تھی کہ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کس طرح پکڑوا سکتی ہوں" ___ حسنو نے کہا ___ "میں خدا کے کاموں میں دخل نہیں دوں گی۔ میرے آگے زیورات کا ڈھیر لگا دو، میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اگر میں نے تمہیں بچا لیا تو تم کسی اور بیوہ کا گھر لُوٹو گے اور ہر جگہ نقب لگاتے پھرو گے اور یہ گناہ میرے کھاتے میں لکھا جائے گا۔ میں اپنی زبان کو ناپاک نہیں کروں گی۔"

تھانیدار نے اُسے یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی کہ حسنو! تم نے ایک

ڈاکو کو قتل کیا ہے۔ تم ان ملزموں کو شور مچا کر پکڑوا سکتی تھیں۔ تمہیں کسی کو قتل کرنے کا حق حاصل نہیں۔ میں تمہیں قتل کے جرم میں گرفتار کر لوں گا۔

دیہات کے لوگ پولیس سے بہت ڈرا کرتے تھے لیکن حسنو نہ ڈری۔ اُس نے تھانیدار سے کہا کہ وہ اُسے گرفتار کر لے اور وہ کچہری میں بتائے گی کہ اُس نے اس آدمی کو کیوں قتل کیا ہے۔

"میں حیران رہ گیا کہ یہ عورت ہے یا کیا ہے" — علی حیدر نے ہمیں یہ قصّہ سناتے ہوئے کہا — "میں نے بڑی خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں لیکن حسنو کی خوبصورتی کے ساتھ اس میں جو دلیری تھی اس نے مجھے حسنو کا مرید بنا دیا۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ جانے دو۔ اس عورت کو مجبور نہ کرو.... مجھے اس گاؤں کے نمبردار نے بتایا تھا کہ یہ بڑے صاف اور پاک چال چلن کی عورت ہے اور یہ نوابوں جیسے آدمیوں کو دھتکار چکی ہے۔"

علی حیدر کو پانچ سال قید ہو گئی تو جیل میں حسنو ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہی۔ علی حیدر کو قید کی مشقت نے انسان بنا دیا۔ وہ عیّاش شہزادہ تھا مگر جیل میں اُسے گدھا بنا لیا گیا۔ یہ اُس کی پہلی سزا تھی۔ اُس کے سارے بَل نکل گئے۔ رو رو کر اُس نے قید کاٹی اور ساڑھے چار سال بعد جیل کی معافی کی وجہ سے جیل سے نکلا۔ وہ ہمارے علاقے میں اُسی ٹھکانے پر آیا جہاں وہ پہلے آ کر ٹھہرا تھا۔

اُس نے اُسی گھر بھیدی کو بلایا جس نے اُسے حسنو کے گھر کی خبر دی تھی۔ یہ شخص علی حیدر کا احسان مند تھا کیونکہ علی حیدر نے اُسے بچا لیا تھا۔ علی حیدر نے اُسے کہا کہ وہ اُسے جھولی بھر کر انعام دے گا، وہ اُسے حسنو سے ملا دے۔ اُسے کہنا کہ تمہارے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں گا، میرے ساتھ شادی کر لو۔ تمہاری زمین بیچ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میری اپنی زمین ہے۔ میں تمہارا غلام رہ کر شریفوں کی زندگی گزاروں گا۔

گھر بھیدی نے حسنو کے ساتھ بات کی۔ حسنو نے جواب دیا کہ میں عزّت اور حیثیت والے آدمیوں کو جواب دے چکی ہوں تم تو ہو ہی ڈاکو۔ علی حیدر کو

یہ جواب ملا تو اُس نے گھر بھیدی سے کہا کہ وہ کسی طرح حسنو سے ملا دے۔ گھر بھیدی کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ حسنو نے ایک روز جواب دیا کہ میں فلاں دن فلاں گاؤں کو جا رہی ہوں اور اُسی دن واپس آ جاؤں گی۔ علی حیدر میری واپسی پر راستے میں کھڑا رہے۔ میں چلتے چلتے اُس کے ساتھ بات کر لوں گی۔

علی حیدر بہت دیر سے یہاں بیٹھا حسنو کی راہ دیکھ رہا تھا۔ حسنو اپنے بچے کو شاید اس لیے ساتھ نہیں لائی تھی کہ وہ بچہ ہے۔ گاؤں میں بتا دے گا کہ اس کی ماں راستے میں ایک آدمی سے ملی تھی۔ وہ علی حیدر کو نظر آئی تو وہ اُٹھا۔ حسنو اُس کے پاس رُک گئی۔ علی حیدر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے حسنو سے معافی مانگی اور کہا — "میں نے شریفوں کی زندگی گزارنے کی قسم کھائی ہے۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں اُس راستے سے ہٹ نہیں سکوں گا جو مجھے جیل خانے میں لے گیا تھا۔ میری محبت کو قبول کر لو۔ مجھ پر رحم کرو۔"

"تم مجھ پر رحم کرنے میرے گھر نہیں آئے تھے" — حسنو نے کہا — "تم میرا گھر خالی کرنے آئے تھے۔ تم میرے دشمن ہو۔ میں اُس خاوند کے ساتھ بیوفائی نہیں کروں گی جس کی قبر پر ہر جمعرات دیا جلاتی ہوں۔"

وہ چل پڑی۔ علی حیدر کے آنسوؤں کی اُس نے پرواہ نہ کی۔

یہ قصّہ سناتے ہوئے بھی علی حیدر کے آنسو نکل آئے تھے۔ وہ اُٹھا اور سر جھکائے ہوئے چلا گیا۔ پچیس چھبیس سال بعد ہم تمام دوست حسنو کے جنازے میں شریک ہوئے۔ اُس کا بیٹا تین بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ حسنو کی قبر اپنے خاوند کے پہلو میں بنائی گئی تھی۔ اُس کے بیٹے نے کہا — "اب میں ان دونوں قبروں پر دیئے جلایا کروں گا۔"

بھیڑیا، بدروح اور بیوی

حکایت کے سالگرہ نمبر کا اعلان پڑھا تو بہت ہی پرانا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب شاید انگریز سالگرہ مناتے ہوں گے۔ شہروں میں سالگرہ کا رواج امیر اور تعلیم یافتہ گھروں میں ہوگا۔ دیہات میں سالگرہ کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔

ہمارے گاؤں کے ایک آدمی کے پاس بڑی اچھی نسل کی ایک کُتیا تھی جس کا نام جپسی تھا۔ یہ نام کُتیا کے مالک نے نہیں رکھا تھا۔ یہ آدمی رسالے میں دفعدار تھا۔ پنشن پر آیا تو اُسے یہ کُتیا رسالے کے ایک انگریز کیپٹن نے انعام کے طور پر دی تھی۔ مجھے بہت مدت بعد پتہ چلا تھا کہ جپسی خانہ بدوشوں کو کہتے ہیں۔

جپسی جوان اور خوبصورت کُتیا تھی۔ ہمارے گاؤں میں آکر وہ یقیناً خوش ہوئی ہوگی کیونکہ یہاں ایک سے ایک خوبصورت اور تندرست و توانا کُتا موجود تھا۔ جپسی انگریزوں کے گھروں میں پلی تھی اس لیے آزاد خیال تھی۔ وہ آتے ہی ہمارے کُتوں کے ساتھ بے تکلف ہوگئی۔ اُس کا نیا مالک اُسے کھُلا چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جپسی کا چال چلن ٹھیک نہ رہا۔ پھر پتہ چلا کہ جپسی نے ہمارے کُتوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف رقابت پیدا کر دی ہے۔ یہ صورتِ حال نہ ہمارے لیے ٹھیک تھی نہ ہمارے کُتوں کے لیے۔ یہ شکاری کُتے تھے اور ان میں جو ٹیم سپرٹ تھی وہ ہم نے ان میں بڑی مشکل سے پیدا کی تھی، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کُتا کُتے کا ویری ہوتا ہے۔

جیسی نے ہمارے کتوں میں آکر نظریاتی تخریب کاری شروع کر دی۔ ٹیم کے دو لیڈر قسم کے کتوں کو آپس میں لڑا دیا۔ جیسی میں دوسری خرابی یہ تھی کہ لگائی بجھائی کرتی تھی۔ ہم کتوں کو سیر سپاٹے اور ٹہلائی کے لیے باہر نکالا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا جیسی میرے کتے کی ناک کے ساتھ اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ وہاں سے ہٹی تو ایک اور کتے کے منہ سے جا اپنا منہ لگایا۔ وہ کتا میرے کتے کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں جیسی نے اس کے کان میں کیا ڈال دیا تھا۔ اسی روز ان دونوں کتوں کی لڑائی ہو گئی۔

جیسی بڑی چالاک کتیا تھی۔ اس نے ہمارے کتوں کے ساتھ ہی نہیں ہمارے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ ایک روز گاؤں سے باہر ہمارے کتے کھلے پھر رہے تھے۔ جیسی اپنے مالک کے ساتھ آگئی۔ تمام کتوں نے اس کی طرف بالکل ویسے ہی دیکھا جس طرح آج کل شہروں میں کوئی جوان عورت سڑک پر نظر آجائے تو ہمارے نوجوانوں کی نظریں اس پر جم جاتی ہیں اور اس کے جسم پر سرکتی پھسلتی اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ نوجوان حضرات تصوروں میں حدود آرڈی ننس کی خلاف ورزی کرنے لگتے ہیں۔

جیسی کا مالک ہمارے پاس آگیا اور اس کی جیسی کتوں کی طرف چلی گئی۔ کہیں سے ایک آوارہ کتیا ادھر آنکلی۔ اتنے سارے کتوں کو دیکھ کر وہ ان کے قریب آگئی۔ سب سے پہلے ہمارا ٹوہلی اس کی طرف بڑھا۔ ٹیم کا کوئی کتا ٹوہلی کے ساتھ بیر پیدا کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ راجہ شہباز خان کا بُل ٹیریئر واحد کتا تھا جو کبھی کبھی ٹوہلی کو احساس دلا دیا کرتا تھا کہ وہ اس کی ڈکٹیٹر شپ کو صرف اس لیے قبول کیے ہوئے ہے کہ ٹیم میں بے مزگی پیدا نہ ہو اور ڈسپلن قائم رہے۔

اس بُل ٹیریئر نے ٹوہلی کو اجنبی کتیا کی طرف جاتے دیکھا تو وہ بھی ادھر چلا گیا۔ باقی کتے دونوں کتوں کو دیکھتے رہے۔ جیسی ان دونوں کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک اجنبی اور آوارہ کتیا کو ہر طرف سے سونگھ رہے تھے۔ جیسی کے منہ سے بڑی غصیلی "بف" نکلی اور وہ دوڑ

پڑی۔ اجنبی کتیا دونوں کتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ جیسی اس پر ٹوٹ پڑی۔ وہ بھاگ نکلی۔ ٹوہلی اور بُل ٹیریئر اس کے پیچھے گئے۔ اجنبی کتیا ذرا دور جا کر رک گئی تھی۔

جیسی پھر اس کتیا کی طرف دوڑی۔ بُل ٹیریئر جیسی کی طرف دوڑا اور اسے ایسی پھینٹی لگائی کہ وہ ہماری طرف بھاگ آئی اور ہماری ٹانگوں میں چھپنے لگی۔ ہمارے گاؤں کا بوڑھا بہشتی ہمارے پاس کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

"کیا زمانہ آیا ہے" ـــ بہشتی نے کہا ـــ "اپنے گاؤں کی اتنی اچھی کتیا کو چھوڑ کر یہ کتے کس بدشکل کتیا کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں"۔

کتا انسان سے وفاداری کرتا ہے، کتیا کے معاملے اور انتخاب میں نہ وہ وفا کی پروا کرتا ہے نہ ذوق کی۔

یہ اس واقعہ سے بہت پہلے کی بات ہے جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں۔ جیسی کو ہمارے گاؤں میں آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ہمارے ٹوہلی کے بچے جنے تھے۔ اس کے بعد شہباز خان کے بُل ٹیریئر کے۔ ٹوہلی کے پانچ بچوں میں سے تین زندہ رہے تھے۔ اس کے مالک نے ایک اپنے لیے رکھ لیا اور دو ہمارے دو دوستوں کو دے دیئے تھے۔

ہمیں تو یاد ہی نہیں تھا کہ ان بچوں کو پیدا ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ ایک روز دفعدار نے کہا کہ پرسوں ٹوہلی کے بچے دو سال کے ہو جائیں گے۔ ہمارے جن دو دوستوں کے پاس یہ بچے تھے، وہ انہیں شکار پر کبھی نہیں لے گئے تھے۔ انہیں وہ کتوں کی لڑائی اور رکھوالی کی ٹریننگ دے رہے تھے۔ دفعدار نے یاد دلایا کہ پرسوں بچے دو سال کے ہو جائیں گے تو ہمارے ایک دوست افضل نے کہا کہ ان کے دو سال پورے ہونے کا جشن مناؤ۔ بڑے اعلیٰ کتے نکلے تھے۔ دو سال میں کتا بچہ نہیں رہتا۔

ہم بھاگنے دوڑنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ ان دنوں فراغت بھی تھی۔ گندم کی فصل کے سٹے اور سرسوں کے پھول نکل آئے

تھے۔ بہار کا موسم جوبن پر تھا۔ ہم نوجوان تھے۔ دفعدار نے بات کی تو لہو گرم رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہ کہا کہ جلیبی کے بچوں کی سالگرہ منائیں گے۔ ہم تو اس لفظ سے واقف بھی نہیں تھے۔ ہم نے پرسوں کا پروگرام بنا لیا۔

یہ دنیا واقعات اور حادثات سے بھری پڑی ہے۔ عجیب و غریب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ایسے انسان سامنے آجاتے ہیں کہ حیران کر دیتے ہیں۔ صرف اُن لوگوں کے لیے دنیا اور زندگی عجائبات سے خالی ہے جو گھروں اور چنڈال چوکڑیوں میں عمر گزار جاتے ہیں۔ اگر میرے بھائی احمد یار خان تھانیدار نہ ہوتے تو انسانی فطرت کی حیران کر دینے والی کہانیاں کبھی نہ سنا سکتے۔ میں نے اور میرے دوستوں نے زندگی کے سمندر میں ڈوب کر وہ دنیا دیکھی ہے جو ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ شخص آخری عمر میں اللہ اللہ کرنے کی بجائے جھوٹے قصے گھڑنے بیٹھ گیا ہے۔ واقعہ جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں اسے محترم میم الف بہتر طور پر سمجھیں گے۔ ہم اُس وقت نوجوان تھے۔ اُس عمر میں اور دیہات میں کوئی خاک سمجھتا ہے!

جب پرسوں کا دن آیا تو ہم گھروں سے نکلے۔ ہماری ماؤں نے ہمیں پراٹھے اور انڈے باندھ دیئے اور ہمیں کوسنوں اور گالیوں سے رخصت کیا۔ مجھے اپنی ماں کی یہ دھمکی دُور تک سنائی دیتی رہی —"آج تو آ واپس۔ میں تیرے ٹکڑے (گردے) اسی کُتے کو نہ کھلادوں تو کہنا"—— مجھے معلوم تھا کہ ماں جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بیٹا صحیح سلامت واپس آجائے۔

ہم ماؤں کی دعائیہ گالیوں کی زد سے دُور نکل گئے۔ پَو پھٹ رہی تھی۔ اپنا گاؤں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہم اتنی دُور تو نہیں گئے تھے، ہم کسّی (برساتی نالے) میں اُتر گئے تھے جو خشک تھا۔ ان کسّیوں میں ساون میں سیلاب آیا کرتا تھا۔ یہ کسّی گہرائی میں تھی۔ میں اُس وقت کا واقعہ سنا رہا ہوں جب ہم نے

کُتوں کے شکار میں ابھی مہارت حاصل نہیں کی تھی۔ ابھی چند مرتبہ ہی شکار پر نکلے تھے۔ اُس وقت تک ہم ایک ہی علاقے میں شکار کو جاتے رہے تھے۔ اُس روز ہمارے ایک دوست نے کہا کہ آج کسی اور طرف چلو۔

ہم نے جس طرف جانے کا فیصلہ کیا اُدھر ہم پہلے کبھی نہیں گئے تھے۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ علاقہ بالکل ویران اور سنسان ہے اور دشوار گزار بھی ہے۔ میں نے اپنی کہانیوں میں آپ کو کئی بار سنایا ہے کہ میری جوانی میں میرے علاقے میں آبادی بہت کم تھی۔ گاؤں دُور دُور تھے اور ان کے اردگرد کے علاقے جنگل بیابان تھے۔ مٹی کی عمودی پہاڑیاں، ٹیلے، گھاٹیاں اور سِلّوں کی چٹانیں تھیں۔ یہ تو اب بھی موجود ہیں لیکن ان کی شکلیں اور ساخت بدل گئی ہے۔ آبادیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ راستے پکّے ہو گئے ہیں۔ جہاں پہلے اُونٹ اور گدھے باربرداری کے لیے استعمال ہوتے تھے، وہاں اب ویگنیں اور سوزوکیاں چلتی ہیں۔ باہر کے پیسے نے سیدھے سادے اور معصوم سے مکانوں کو چوبارے اور کوٹھیاں بنا دیا ہے۔ علاقے کا قدرتی پن ختم ہو گیا ہے۔

ہم کسّی سے ایک گھاٹی چڑھ کر نکل گئے اور اُس طرف چل پڑے جدھر دوستوں نے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سُنا تھا کہ تین ساڑھے تین میل آگے کا علاقہ خطرناک ہے۔ خطرناک کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کے نشیب گہرے تھے جن میں درخت تھے۔ کھڈ اور چھوٹے چھوٹے نالے زیادہ تھے۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ سِلّوں کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی تھیں۔ یہی کسّی جس میں سے ہم نکلے تھے، بل کھاتی ہوئی اُس علاقے میں سے گزرتی تھی۔ ہمارے علاقے میں جس علاقے کو خطرناک کہا جاتا، اُس کے متعلق یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چڑیل دن کے وقت خوبصورت عورت بن کر راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی آدمی اُسے عورت سمجھ کر اُس کے ساتھ چل پڑے تو وہ اُسے اپنی جگہ لے جا کر اُس کا کلیجہ اُس کے منہ کے راستے نکال لیتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی جنّ بکری یا بھیڑ کے بچّے کی صورت میں کسی مسافر کے راستے میں آجاتا ہے۔ اُسے کوئی سچ مچ کا بچہ سمجھ کر پکڑ لے یا اُٹھا

لے تو وہ اُس آدمی کے ہاتھوں میں غائب ہو جاتا ہے اور اُس آدمی کو پتھر پڑنے لگتے ہیں۔

ہم اُسی طرف جا رہے تھے ۔ ہمارے نیچے کوئی راستہ نہیں تھا ۔ اُونچی نیچی زمین تھی۔ کہیں گہرے گڑھے تھے اور کہیں زمین اُبھری ہُوئی تھی۔ کہیں ہم گھاٹی اُتر رہے تھے کہیں گھاٹی چڑھ رہے تھے ۔ سورج کچھ اُوپر آگیا تھا۔ کُتوں کو ہم نے کھُلا چھوڑ دیا تھا ۔ دس کُتے تھے جن میں دو جیسی کے بیٹے تھے ۔

ڈیڑھ دو میل گئے تو تنگ سی ایک پگڈنڈی آگئی۔ بڑ کا ایک گھنا درخت دیکھا تو ذرا استانے کے لیے اس کے نیچے بیٹھ گئے ۔ ہمیں چھاؤں کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم میں ابھی تپش پیدا نہیں ہوئی تھی ۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ چار اُونٹ آگئے ۔ ان پر شیشم کے کٹے ہُوئے درختوں کے تنے اور بڑے موٹے ٹہن لدے ہُوئے تھے ۔ ان اونٹوں کے ساتھ دو شتربان تھے وہ رُک گئے ۔ اُنھوں نے اونٹوں کو آرام دینے کے لیے بٹھا دیا اور خود ہمارے پاس بیٹھ گئے ۔ ہم سے ہمارا گاؤں پوچھا اور یہ بھی کہ ہم شکار کے لیے کدھر جا رہے ہیں۔ اس طرح گپ شپ چل پڑی ۔

"تم نے بھیڑئیے اور کتیا کی دوستی کبھی سُنی ہے؟" — ایک شتربان نے پوچھا۔

"ہم نے یہی سُنا ہے کہ بھیڑیا بڑا ظالم درندہ ہوتا ہے" — ہم میں سے کسی نے کہا — "اور سُنا ہے کہ کُتے کو بھیڑیا مار کر کھا جاتا ہے"۔

"ہاں، بھیڑیا ایسے ہی کرتا ہے" — شتربان نے کہا — "لیکن جدھر تم جا رہے ہو ادھر ایک بھیڑیا رہتا ہے جس نے بادامی رنگ کی ایک کُتیا کو ساتھ رکھا ہُوا ہے ۔ دونوں اکٹھے گھومتے پھرتے رہتے ہیں"۔

"کسی نے انہیں دیکھا ہے؟" — میں نے کہا — "ہو سکتا ہے وہ جنگلی کُتا ہی ہو"۔

"دُور سے" — شتربان نے جواب دیا — "بعض آدمیوں نے دُور

سے دیکھا ہے ۔ وہ کُتا نہیں بھیڑیا ہے ۔ جن دنوں کُتیا بچے جنتی ہے اُن دنوں تو یہ بھیڑیا اس علاقے سے کسی کو گزرنے نہیں دیتا"۔

"اُدھر سے کوئی راستہ گزرتا بھی نہیں" — دوسرے شتربان نے کہا — "پھر بھی گھوڑی ٹٹو پر سوار کوئی مسافر راستہ چھوٹا کرنے کے لیے اُدھر سے گزرتا ہے ۔ میں نے ایسے دو مسافروں سے خود سنا ہے کہ بھیڑیا اور کُتیا اُن کے پیچھے دوڑے ۔ وہ خوش قسمت تھے کہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گھوڑے دوڑا کر بچ کر نکل آئے ۔ ایک آدمی اپنی گدھی کو چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ بھیڑئیے نے گدھی کو مار ڈالا تھا ۔ جن لوگوں کو معلوم ہے وہ اِدھر سے نہیں گزرتے"۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہ بھیڑیا ہے نہ کُتا" — ایک شتربان نے کہا — "اور جسے لوگ کُتیا کہتے ہیں وہ کُتیا نہیں ۔ یہ دونوں شرِ شرار ہیں۔ ایک سادھو مہنت اِدھر سے گزرا تھا۔ اُس نے دونوں کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ کسی زمانے میں ایک مسلمان آدمی اور ایک ہندو لڑکی کی محبت ہیر رانجھے جیسی تھی ۔ لڑکی اس جوان آدمی کے پیچھے گھر سے بھاگ آئی۔ دونوں گاؤں سے نکل کر کہیں جا رہے تھے ۔ اس جگہ سے گزر رہے تھے تو انہیں ڈاکو مل گئے۔ اُنھوں نے لڑکی کا سارا زیور اتار لیا۔ وہ جس آدمی کے ساتھ آئی تھی اُس کے پاس کلہاڑی تھی ۔ وہ ڈاکوؤں سے لڑا ۔ لڑکی بھی لڑی ۔ آخر دونوں مارے گئے ۔ ڈاکوؤں نے اُن کی لاشیں وہیں دبا دیں ۔ تھوڑے عرصے بعد دونوں کو یہاں اصلی رُوپ میں اکٹھے دیکھا گیا۔ پھر کسی نے یہاں ایک ہرن اور ایک ہرنی کو کھڑے دیکھا۔ ہمارے علاقے میں ہرن ہوتے ہی نہیں ....

"یہ دونوں کسی نہ کسی روپ میں کبھی کبھی نظر آتے تھے ۔ یہ بھی سنا تھا کہ رات کو یہاں سے کسی عورت کے رونے کی آوازیں بھی آیا کرتی تھیں۔ پھر کچھ عرصہ وہ غائب ہو گئے ۔ اب چھ سات مہینوں سے وہ اس رُوپ میں آگئے ہیں کہ آدمی بھیڑیا ہے اور لڑکی کُتیا ۔ یہ بد رُوحیں ہیں"۔

"یہی بات صحیح ہو سکتی ہے" — دوسرے شتربان نے کہا — "بھیڑئیے

اور کُتّے کی دوستی نہیں ہوسکتی۔"

"لیکن بدرُوحیں بچّے تو نہیں پیدا کیا کرتیں" ـــــ ہمارے دوست افضل نے کہا۔

"اللہ کی اللہ جانے" ـــ ایک شتربان نے کہا ـــ "تمہارے پاس اتنے سارے کُتّے ہیں۔ جاکر دیکھ لو۔"

"ہاں" ـــ دوسرے شتربان نے کہا ـــ "اگر بھیڑیا ہُوا تو تم اُسے مار لو گے اور وہ کوئی ایسی ویسی چیز ہوئی تو تمہیں اپنا آپ دکھا دے گی۔"

یہ تو پسماندگی کے دَور کی باتیں ہیں۔ دیہات میں آج کل بھی یہی رواج ہے کہ جس چیز کے متعلق لوگ کچھ بھی نہیں جانتے، اُس کے متعلق ایسی باتیں مشہور کرتے ہیں جیسے وہ سب کچھ جانتے ہوں۔ دیہات میں کیا، شہروں میں تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی یہی حال ہے۔ سنسنی پیدا کرنے والی باتوں کو لوگ پسند بھی بہت کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں ہم بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ہمیں بھی پُراسرار باتیں اور واقعات اچھے لگتے تھے لیکن مجھ میں اور شہباز خان میں ڈھیٹ پن اتنا زیادہ تھا کہ ہم اسرار کے اندھیرے غاروں کے اندر جانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ہمارے دوست ہمارا اثر قبول کر لیتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔

ان شتربانوں کو دُور جانا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے اور روٹی بھی کھاتے رہے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ کھاپی کر وہ چلے گئے۔ ہم آپس میں بھیڑئیے اور کُتیا کی باتیں کرتے رہے۔ میرے کچھ دوست کہتے تھے کہ یہ بھیڑیا نہیں جنگلی کُتا ہوگا۔ دو تین دوستوں کی رائے میں وزن تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کُتا آبادی سے دُور نہیں رہ سکتا۔ آپ نے اپنے گاؤں یا شہر میں آوارہ کُتّے دیکھے ہوں گے۔ انہیں اپنی آبادی سے نکال دو تو کسی اور آبادی میں چلے جائیں گے۔

رائے ہر ایک کی اپنی اپنی تھی۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ ذرا آگے جاکر دیکھتے ہیں۔ اگر وہ نظر آ گئے تو دیکھیں گے کہ وہ کُتّے ہیں یا بھیڑئیے۔ یہ فیصلہ بھی

ہُوا کہ وہیں کہیں جاکر روٹی کھائیں گے۔

ہم اُٹھے، کتّوں کو زنجیریں ڈال لیں اور ہم اس چھوٹی سی پگڈنڈی سے دُور ہٹتے ہٹتے کم و بیش ڈیڑھ میل دُور چلے گئے۔ آج اس جگہ کا حُلیہ ہی بگڑا ہُوا ہے۔ وہاں سے پکّی سڑک گزرتی ہے اور اینٹوں کا بھٹہ چل رہا ہے۔ بھٹے کے اِردگرد مکان ہیں۔ اِس جگہ کا وہ ڈراؤنا پن ختم ہو چکا ہے جو ہماری جوانی میں ہُوا کرتا تھا۔ ہمیں اس جگہ کے ڈراؤنے پن اور اس کی ہیبت سے محبت تھی۔ یہ اس جگہ کا قدرتی رُوپ تھا۔ میرے پاس الفاظ کا اتنا ذخیرہ نہیں کہ اس کے قدرتی رُوپ کو بیان کر سکوں۔ ویران علاقہ تھا اور ہم نیچے ہی نیچے ہوتے جا رہے تھے۔

آگے ایک گھاٹی آگئی۔ ہم اس سے اُتر گئے۔ ایسے لگا جیسے ہم بہت ہی وسیع قلعے میں آگئے ہوں۔ ہمارے اِردگرد قلعے جیسی دیواریں کھڑی تھیں۔ باقی علاقہ اِن دیواروں کے اُوپر اُوپر تھا۔ یہ سمجھ لیں کہ گہرا اور وسیع و عریض نشیب تھا۔ اس میں مٹی کے ٹیلے بھی کھڑے تھے اور سِلّوں کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی تھیں۔ درخت بے شمار تھے۔ ہوا کے جھونکے سِلّوں سے ٹکرا کر گزرتے تھے تو ایسی آوازیں سنائی دیتی تھیں جیسے دُور کہیں یا کسی غار یا گُف میں دو تین عورتیں رو رہی ہوں۔

"ڈرو نہیں اوئے!" ـــ ہمارے ایک دوست نے کہا جسے ہم موٹر کہا کرتے تھے ـــــ "وہ جو اونٹوں والے کہتے تھے کہ اس علاقے میں عورتوں کے رونے کی آوازیں سنی گئی ہیں، یہی آوازیں ہوں گی۔ آؤ، قریب ہو کر سنتے ہیں۔"

ہم نے قریب جاکے دیکھا۔ چٹانیں دو تھیں جو ایک دوسری کے متوازی دُور تک چلی گئی تھیں۔ اِن میں سے سِلّیں ذرا ذرا باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ چٹانیں ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ ہوا کا رُخ ایسا تھا کہ چٹانوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ جب آندھی چلتی ہوگی تو یہاں سے کتنی خوفناک آوازیں نکلتی ہوں گی۔ چٹانوں کے درمیان صاف پتہ چلتا تھا کہ برسات میں یہاں سے سیلابی پانی گزرتا ہے۔ پانی نے بھی چٹانوں کو نیچے سے کھایا ہُوا تھا۔ ہم نے

قریب ہو کر دیکھا کہ وہاں سے جب ہوا گزرتی تھی تو بالکل رونے جیسی آواز پیدا ہوتی تھی۔

آوازوں کے راز سے پردہ اُٹھ گیا تو ہم سب کچھ دلیر ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اندر سے ڈرے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈر کا اظہار کوئی نہیں کرتا تھا۔ ہم ان چٹانوں سے آگے نکل گئے۔ تقریباً دو فرلانگ دُور اس نشیب کی جو دیوار تھی، ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ وہاں سے اُس طرف کا تھوڑا سا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے اس شگاف کی طرف چلے گئے۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے، ہماری زبانیں رُکنے لگی تھیں۔ کوئی بولتا تھا تو ذرا دبی ہوئی زبان میں بات کرتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہم سب ڈرے ہوئے ہیں۔ درخت زیادہ تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا تو ہلکی سی آواز پیدا کرتا تھا۔ اس آواز سے بھی ہم کچھ بدک سے جاتے تھے۔ ہم شگاف سے چند قدم دُور تھے کہ دوسری طرف سے ہمیں اس طرح آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی آدمی بول رہا ہو اور کوئی عورت ہنس بھی رہی ہو اور کچھ کہہ بھی رہی ہو۔ ان آوازوں سے میرے دوستوں کا اندر کا خوف اُن کے چہروں پر آ گیا۔ ہم سب رُک گئے۔ ہم میں سب سے زیادہ دلیر ہمارا دوست موتڑ تھا۔ اُس نے اپنے کُتے کی زنجیر کسی کے ہاتھ میں دے دی اور دبے پاؤں شگاف تک چلا گیا۔

اُس نے شگاف کی اوٹ میں رُک کر دوسری طرف جھانکا۔ اتنے میں ہم اُس کے کچھ قریب پہنچ گئے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ موتڑ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اتنا دلیر لڑکا اپنی گھبراہٹ کو چھپا نہ سکا۔ میں اور شہباز خان آگے بڑھے۔ ہم نے بھی شگاف سے چھُپ کر اُدھر دیکھا۔

میں بدرُوحوں کا قائل ہو گیا۔ میں جو دیکھ رہا تھا وہ اس علاقے میں نظر آنا ناممکن تھا۔ ایک جوان آدمی تھا جسے آپ نوجوان کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے بوسکی کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اُس کے سر پر کُلّے پر مشہدی لنگی بندھی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ بڑی حسین لڑکی تھی۔ شکل و صورت کے علاوہ اُس کا قد بُت بہت ہی اچھا تھا۔ اُس نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔

یہ شگاف جس میں سے ہم چھُپ کر انہیں دیکھ رہے تھے، اس میں سے اب مجھے سامنے کا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایسا ہی نشیب تھا جس قسم کے نشیب میں ہم کھڑے تھے۔ وہ نشیب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ بڑی اچھی اوٹ تھی۔ وہاں درخت بھی زیادہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان جو خاصا تندرست اور توانا تھا اور جس کا جسم پہلوانوں جیسا تھا، لڑکی کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور لڑکی ہنستی بھی تھی اور اُس سے کلائیاں چھڑانے کی کوشش بھی کرتی تھی۔

لڑکی نے کلائیاں چھڑا لیں اور ایک طرف دوڑ پڑی۔ نوجوان نے دوڑ کر اُسے کمر سے پکڑ لیا۔ وہ مُسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا اور لڑکی جھُک کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر شاید منہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ ہنستی بھی تھی، کچھ کہتی بھی تھی۔

میں اُن کی ہر ایک حرکت بیان نہیں کر رہا ورنہ کہانی بڑی لمبی ہو جائے گی۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ وہ دونوں رُومانی مُوڈ میں تھے لیکن ہمارے لیے سوچنے والی بات یہ تھی کہ اس جگہ کے قریب کوئی گاؤں نہیں تھا۔ اگر یہ گھر سے بھاگے ہوئے ہوتے تو اس طرح ہنس کھیل نہ رہے ہوتے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اس قدر ڈرا کہ ڈر کو چھپا نہ سکا۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میری ٹانگیں بے جان ہو گئی ہوں۔ میرا دوست شہباز خان مجھ سے زیادہ مضبوط دل والا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا نظر آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے چہرے کا رنگ بھی اسی طرح اُڑا ہُوا ہو گا۔

وہ دونوں ہنستے کھیلتے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ مٹی کی اُس عمودی دیوار کے ساتھ ہو گئے تھے جس میں یہ شگاف تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ شگاف سے آگے بڑھ کر دیکھتا کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ اُن کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ یہیں ہیں۔

مجھے دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو بلند ہوتی گئی۔ اچانک

لڑکی شگاف میں پہنچی اور ٹھٹھک کر وہیں رُک گئی۔ اُس کا چہرہ بُجھ گیا۔ اُس کا تو چہرہ بُجھا تھا لیکن میں اپنی حالت آپ کو بتاتا ہوں کہ یوں لگا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو۔ اگر مجھے اپنی مردانگی کا پاس نہ ہوتا تو میں گر پڑتا۔ مجھے پیچھے سے اپنے کسی دوست کی سرگوشی سنائی دی ــــ "کلمہ شریف پڑھو.... یہ انسان نہیں۔"

یہ تو میں پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا کہ یہ انسان نہیں اور یہ اُنہی دو انسانوں کی بدرُوحیں ہیں جنہیں ڈاکوؤں نے یہاں مار ڈالا تھا۔ آدمی مسلمان تھا اور لڑکی ہندو تھی۔ دونوں ویسے ہی خوبصورت تھے جیسے شتربانوں نے بتایا تھا۔ لڑکی نہایت آہستہ آہستہ اُلٹے قدم پیچھے ہٹنے لگی۔ ادھر ہم جو تیرہ چودہ نوجوان تھے، اُن کی حالت یہ تھی جیسے کھڑے کھڑے سب کی روحیں جسموں سے نکل گئی ہوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے کُتّے بھی خاموش ہو گئے تھے۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے سورج بھی آسمان میں جہاں تھا وہیں رُک گیا ہے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ یہ لڑکی جہاں ہے وہیں غائب ہو جائے گی یا وہ چڑیلوں کے رُوپ میں آ کر ہم سب کے کلیجے منہ کے راستے باہر نکال لے گی۔ لڑکی دو ہی قدم پیچھے ہٹی تھی کہ وہ رُک گئی۔ مجھے ایسے شک ہُوا جیسے وہ مسکرائی ہو۔ اُس کے سب سے زیادہ قریب میں ہی تھا۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم...." میرے منہ سے بے اختیار نکلا ــــ "تم....تم...." میری زبان تھتھلا رہی تھی۔ میں نے بڑی مُشکل سے یہ الفاظ منہ سے دھکیل کر باہر نکالے ــــ "تم انسان ہو.... ہم چلے جائیں؟"

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اُس نے دائیں بائیں سر ہلایا۔ پھر آہستہ سے بولی ــــ "تم نے مجھے شاید ڈائن یا چڑیل سمجھ لیا ہے میں انسان ہوں۔"

اچانک اُس کا جوان ساتھی شگاف میں نمودار ہُوا لیکن اُس کا تاثر لڑکی والا نہیں تھا۔ وہ احمقوں کی طرح ہنسا۔ پھر اُس نے ہمارے کتّوں کی طرف

دیکھا۔

"کُتّے!" ــــ اُس نے بچوں کے سے لہجے میں کہا جیسے کسی بچّے نے کھلونا دیکھ لیا ہو۔ وہ احمقوں یا بچّوں کی طرح ہنس کر بولا ــــ "اوہ.... کُتّے ہی کُتّے" ــــ وہ جُھکا جُھکا ہمارے درمیان پھرنے لگا۔ اُس نے کسی کُتّے کے سر پر ہاتھ پھیرا کسی کی پیٹھ تھپکائی اور ہنستا ہی رہا۔

میں یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ ہمارے کسی کتّے نے اُس کی طرف توجہ نہ دی۔ کُتّا اجنبی کو دیکھ کر اگر نہ بھونکے تو وہ اتنا ضرور کرتا ہے کہ اجنبی سے دُور ہٹ کر اپنے مالک کے قریب ہو جاتا ہے۔ اب تو مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ یہ بدروحیں ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ بدروحوں، جنّوں اور چڑیلوں کی طرف پیٹھ کر کے بھاگنا بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ ہم نے بھاگنے کی سوچی ہی نہیں تھی لیکن وہاں کھڑے رہنا بھی ہمارے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وقت گزر ہی نہیں رہا۔

ہمارے کچھ دوست ذرا دُور کھڑے تھے۔ یہ نوجوان جو دراصل بدرُوح تھی، ہمارے ان دوستوں کے کُتّوں کو دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ لڑکی یا بدرُوح آگے بڑھ آئی تھی۔ میں اُس کے قریب تھا۔ معلوم نہیں مجھ میں یہ دلیری کس طرح آ گئی کہ میں نے لڑکی سے پوچھا ــــ "یہ کون ہے؟"

"میرا خاوند ہے" ــــ لڑکی نے ذرا شرما کر جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنی کنپٹی سے اپنے ہاتھ کی انگلیاں لگا کر ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کا دماغ صحیح نہیں۔

میں نے اُس کے اِس اشارے پر اعتبار نہ کیا، بلکہ مجھے خیال آیا کہ اس کے اشارے کا مطلب کچھ اور ہے۔ اتنے میں وہ خوبصورت اور تنومند نوجوان اپنی مخصوص ہنسی ہنستا ہُوا شگاف کی طرف آیا۔ میں مان نہیں سکتا تھا کہ اتنا خوبصورت اور اتنا تندرست لڑکا جو امیر ماں باپ کا بیٹا معلوم ہوتا تھا، پاگل ہو سکتا ہے۔ ایسی حرکتیں کرنے والے کو جھلّا کہا جاتا ہے۔ اگر وہ جھلّا ہی تھا تو اُسے اتنی خوبصورت دُلہن کس طرح مل گئی تھی.... نہیں.... یہ دونوں

جیتے جاگتے انسان نہیں تھے۔

"گھوڑا"—اس نوجوان نے کہا۔شگاف میں کھڑے ہو کر اُس نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا—"وہ .... میرا گھوڑا .... دو گھوڑے .... دو"۔ اور وہ اُس طرف دوڑ پڑا۔

میں اور میرے دو ساتھی شگاف سے آگے ہو گئے۔ ہم جس دیوار (ہماری زبان میں دندی) کے شگاف میں سے آگے ہوئے تھے، یہ دیوار ایک جگہ سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ وہاں دو گھوڑے کھڑے تھے۔ بڑے اچھے گھوڑے تھے۔ ایک کی زین کے ساتھ ایک گٹھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور گھوڑا ہماری طرف لے آیا۔

"یہ گھوڑا میرا"—اُس نے کہا—"دیکھو۔ دوڑے گا"

"نہیں"—لڑکی نے اُسے کہا"نہیں دوڑے گا گھوڑا۔ اُتر آؤ۔"

"نہیں"—نوجوان نے بچوں کی طرح منہ بسور کر کہا—"دوڑے گا گھوڑا"— اور اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

وہاں جگہ تو کھُلی تھی لیکن اُونچی نیچی تھی اور درخت زیادہ تھے۔وہ گھوڑے کو درختوں کے دائیں بائیں سے گذارتا جا رہا تھا۔

"تم میں کوئی اچھا سوار ہے؟"—لڑکی نے پوچھا"خدا کے لیے کوئی اس کے ساتھ ہو جاؤ۔یہ گر پڑے گا۔ وہ گھوڑا لے لو۔"

سوار تو ہم سب تھے۔ وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ہم میں سب سے اچھا سوار ہمارا ایک دوست اجمل تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھوڑے پر بیٹھے۔ مجھے انجام بہت بُرا نظر آ رہا تھا۔میں نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا تھا کہ یہ دونوں انسان ہیں لیکن اجمل دوڑ کر گھوڑے تک پہنچا اور اس پر سوار ہو کر گھوڑا اُدھر کو دوڑا دیا جدھر وہ نوجوان گیا تھا۔ وہ گھوڑے کو چکر میں دوڑا رہا تھا۔

"خُدا کے لیے ہمیں سچ بتاؤ تم کون ہو"—ہمارے دوست افضل نے لڑکی سے کہا—"سچی بات ہے ہم ڈر رہے ہیں۔ تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اُس نے اپنے گاؤں کا اور اِس نوجوان کے گاؤں کا نام بتایا اور کہنے لگی—

"میں نے بتایا نہیں کہ یہ میرا خاوند ہے؟ اس کے دماغ میں کوئی خرابی ہے لیکن یہ پاگل نہیں۔ حرکتیں اور باتیں پاگلوں جیسی کرتا ہے .... میں جانتی ہوں تم مجھے چڑیل سمجھ رہے ہو۔ میری زبان پر یقین کرو۔ یہ میرے قریبی رشتہ داروں میں سے ہے۔"

لڑکی ہماری عمر کی تھی اس لیے ذرا بے تکلفی سے بات کر رہی تھی لیکن وہ بہت تیز بول رہی تھی تاکہ اپنے خاوند کے آنے سے پہلے ہمیں اُس کے متعلق بتا دے۔ برادری کی پابندیاں آج بھی ہیں لیکن اُس زمانے میں یہ پابندیاں بہت سخت تھیں۔ بچی یا بچہ پیدا ہوتے ہی فیصلہ کر دیا جاتا تھا کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو گی۔ میں نے ایسی شادیاں بھی دیکھی ہیں کہ لڑکے کی عمر دس سال ہے اور لڑکی کی عمر سولہ سترہ سال اور ان کی شادی کر دی گئی کیونکہ رشتہ برادری سے باہر دیا نہیں جا سکتا تھا اور لڑکا یہی تھا۔ میں نے اٹھارہ انیس سال کا دولہا اور نو سال عمر کی دُلہن بھی دیکھی ہے۔

کچھ ایسی ہی مجبوری اس برادری میں تھی۔ اتنی خوبصورت اور دلکش لڑکی کو ایک جھلّے کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ میں سُنا چکا ہوں کہ اس جوان لڑکے کو دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی تھی لیکن وہ نیم پاگل تھا۔ لڑکا امیر زمینداروں کا بیٹا تھا۔ ہمارے علاقے کی زمینیں بارانی ہیں۔ اِس لڑکے کے باپ کی یہاں بھی بہت زمین تھی اور نہری علاقے میں اُس کے تین مربعے تھے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کے ماں باپ نے اس خاندان کو امیر سمجھ کر اپنی بیٹی دے دی تھی۔ یہاں وہی معاملہ تھا، جس کے گھر دانے اُس کے کملے بھی سیانے!

میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لڑکی غمگین اور اُداس ہے لیکن وہ بالکل مطمئن نظر آتی تھی، کہتی تھی کہ یہ خاوند اُس کے ساتھ دِلی طور پر محبت کرتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ یہاں کیا کر رہے تھے۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور خاوند اُسے واپس لا رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ سیدھے راستے یعنی پگڈنڈی سے چلتے ہیں لیکن یہ ضد کرتا تھا کہ اِدھر سے چلیں گے۔ اِدھر کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن یہ اِدھر ہی خوش ہو رہا تھا۔ یہاں اوٹ میں اُترے تو دُولہا میاں پر رومانی

مُوڈ طاری ہوگیا۔ اُس نے دُلہن کو گھوڑے سے اُتارا اور خود بھی اُتر آیا۔ لڑکی نے ہمیں ایسی بات نہیں بتائی۔ میں سمجھ گیا۔ میں نے اِن دونوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔

ہم نے اُدھر دیکھا۔ اِس لڑکی کا خاوند جس کا میں اصل نام نہ لکھوں تو بہتر ہے، ابھی تک گھوڑا دوڑا رہا تھا اور اجمل اُس کے ساتھ تھا۔ لڑکی کو کچھ اور باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ اس کا دماغ صحیح ہے۔ اگر دماغ صحیح نہ ہوتا تو اسے دو گھوڑے دے کر ماں باپ اتنی دُور اکیلا نہ بھیجتے۔ میں اس کا اصلی کی بجائے فرضی نام اشرف لکھ دیتا ہوں۔ اس میں نقص یہ پیدا ہوگیا تھا کہ اپنے آپ کو دو تین سال کا بچّہ سمجھتا تھا۔ ماں باپ کی واحد اولاد تھا جو انہیں خانقاہوں مزاروں اور پیروں فقیروں کے آستانوں پر ماتھا رگڑ رگڑ کر اور منتیں مان مان کر ملا تھا۔ ماں باپ نے اسے اس طرح پالا پوسا کہ اس کے پاؤں زمین پر نہ لگنے دیئے۔ تیرہ چودہ سال عمر تک ماں اسے اپنے پاس سُلاتی اور اس کے ساتھ ایسی باتیں کرتی رہی جیسے یہ ابھی دُودھ پیتا بچّہ ہو۔ گھر میں دولت تھی۔ لڑکے کے مُنہ سے جو بات نکل گئی وہ ماں باپ نے پوری کی۔

اُس وقت میں نادان نوجوان تھا۔ نفسیات کا نام تک نہ سُنا تھا۔ بہت مدّت بعد جب کتابیں رسالے پڑھنے کا چسکا پڑا تو یہ لڑکا کئی بار یاد آیا۔ بڑھاپے میں آکر محترم میم۔ الف کے مضامین پڑھے تو عقل ذرا تیز ہوگئی۔ یہ لڑکا جواں عمر کی آخری منزل کے قریب پہنچ گیا ہے، جسمانی لحاظ سے تندرست اور توانا ہوگیا لیکن ماں باپ نے اُسے بچپنے سے نہ نکلنے دیا۔ اس کا اثر لڑکے نے یہ قبول کیا کہ ذہنی طور پر وہ تین سال کا بچہ بنا رہا۔ اُس کی شادی کو پانچ چھ مہینے گزر گئے تھے۔ وہ اپنے جسم کے استعمال سے واقف تھا لیکن اس کے ذہن پر بچپن غالب تھا۔ میرا خیال ہے کہ نفسیات کے علم کو سمجھنے والوں کے لیے یہ کیس عجیب و غریب نہیں ہوگا۔

اجمل اُسے واپس لے آیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی گردن پر تھپکی دے کر کہا ـــ "میرا گھوڑا.... وہ گھوڑا اس کا (بیوی کا).... دو گھوڑے"۔

ہم سب نے اُسے خوب داد دی۔

"یہ کُتّا دے دو" ـــ اُس نے جیپی کے ایک بیٹھے کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــ "گھوڑا لے لو۔ کُتّا دے دو"۔

"یہ کُتّا اچھا نہیں" ـــ نوجوان بیوی نے اُسے کہا "گھر چلو، میں تمہیں اس سے اچّھا کتّا لے دوں گی"۔

وہ بچوں کی طرح ہنسا اور بولا ـــ "اس سے اچھا کُتّا!.... ہاہاہا.... قسم کھاؤ لے دو گی؟.... تم ایسے ہی کہہ دیتی ہو"۔

ہماری عمر ایسی تھی کہ اس طرح باتیں کرنے والے جھلّے کو دیکھ کر ہم ہنسا کرتے اور اُسے چھیڑا کرتے تھے لیکن اس نوجوان کو اور اُس کی بیوی کو دیکھ کر ہم سب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ مجھے زیادہ افسوس لڑکی کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔ ہماری خاموشی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابھی تک ہمیں شک تھا کہ یہ بدرُوحیں ہیں۔ بڑا عجیب جوڑا تھا۔ اتنی لمبی عمر میں اس سے زیادہ عجیب جوڑے اور ذہنی مریض دیکھے ہیں لیکن نوجوانی کے اُن دنوں وہ میاں بیوی بلکہ دولہا دلہن مجھے اتنے عجیب لگے کہ میں یقین کرنے سے گھبرا رہا تھا کہ یہ ہماری طرح جیتے جاگتے انسان ہیں۔

لڑکی نے اُسے چلنے کو کہا تو اُس نے ہماری طرف دیکھا اور ہنسا۔ اجمل گھوڑے سے اُتر آیا۔ لڑکی نے اس گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکے گی اور اُسے مدد کی ضرورت پڑے گی لیکن وہ پختہ کار سواروں کی طرح گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اُس نے اپنے خاوند کو سر سے اشارہ کیا کہ چلو۔ خاوند نے لگام کو جھٹکا دیا اور دونوں گھوڑے پہلو بہ پہلو چل پڑے۔ ہم کھڑے دیکھتے رہے۔

"نہیں یار!" ـــ اجمل نے کہا ـــ "یہ جن یا شر شرار نہیں ہو سکتے۔ میں نے گھوڑا اس کے گھوڑے کے ساتھ رکھا تھا اور میں ڈرتا رہا تھا کہ یہ ابھی اپنا رُوپ بدل کر کچھ اور بن جائے گا.... یہ انسان ہی معلوم ہوتے ہیں"۔

ہم سب آگے چل پڑے۔ دونوں گھوڑے ایک ٹیلے کے پیچھے چلے

گئے تھے۔ آگے شاید ایک اور نشیب تھا۔ ہمیں وہاں کے درختوں کے اُوپر کے حصے نظر آرہے تھے۔ ہم سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ آگے چل کر دیکھیں گے کہ وہ جا رہے ہیں یا غائب ہو گئے ہیں۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر لی اور انہی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ یہ اگر ہماری طرح انسان ہیں تو یہ لڑکی اس خاوند کی وفادار نہیں ہو سکتی۔ یہ اس پہ اور ہر کسی پر یہ ظاہر کرتی رہتی ہو گی کہ اُسے یہ خاوند بہت پسند ہے۔ اس لڑکی نے اپنے دل کی خوشی کا کوئی خفیہ انتظام کر رکھا ہو گا۔

میری رائے بھی یہی تھی۔ لڑکی مطمئن ہی نہیں خوش بھی تھی اور وہ بلا جھجک بولتی تھی۔ زبان کی تیز اور کچھ چالاک بھی لگتی تھی۔ اس قسم کے نیم پاگل کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکتی تھی۔

ہم جوڑے ٹیلے سے بھی آگے نکل گئے۔ وہاں سے جو علاقہ شروع ہوتا تھا، وہ ڈراؤنا سا تھا۔ مٹی کے ٹیلے کھڑے تھے۔ ان کی شکلیں عجیب عجیب تھیں۔ ان سے آگے اور ان کے درمیان بھی شیشم اور کیکر کے درخت تھے۔ یہ علاقہ گہرائی میں تھا۔ اِسے مٹی کی دیواروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس میں بھی گہرے سلیٹی رنگ کی چٹانیں تھیں۔

یہ علاقہ ہمیں ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ بائیں طرف ایک گھاٹی اُوپر جاتی تھی۔ ہم وہاں سے اُوپر چڑھ گئے۔ وہ دونوں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس سے ہمیں پھر شک ہونے لگا کہ وہ انسان نہیں تھے اور غائب ہو گئے ہیں۔ ہمارے دو دوستوں نے کہا کہ واپس چلنا چاہیئے۔ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ہم اب اُوپر کے علاقے میں جا رہے تھے جہاں سے ہمیں اپنے خطے کی وسعت میل ہا میل دُور تک نظر آ رہی تھی۔ دُور کشمیر کے برف پوش پہاڑ تھے۔ اتنی وسعت دیکھ کر میرا دل ذرا مضبوط ہو گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تھوڑی دُور تک چلتے ہیں، اللہ مالک ہے۔

ہم چلتے گئے۔ کُتوں کو ہم نے زنجیریں ڈال رکھی تھیں۔ یہ تو ہم بھول ہی

گئے تھے کہ ہم شکار کھیلنے آئے ہیں۔ اُس عمر میں ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم شکار نہیں کھیل رہے تو اور کیا کر رہے ہیں۔ جی میں آتی تھی کہ کچھ کریں، بھاگیں دوڑیں، اپنے علاقے کی ہیبت ناک جگہوں کے راز معلوم کریں اور خطروں میں کُود جائیں۔ بڑھاپے میں آ کر جب ڈائجسٹ رسالے نکلنے شروع ہُوئے تو مجھے پتہ چلا کہ ہم مہم جوئی کیا کرتے تھے جسے انگریزی میں ایڈونچر کہتے ہیں۔

ہم ایڈونچر کے خیال سے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ دائیں طرف ہمیں درختوں کے بالائی حصے نظر آ رہے تھے۔ کچھ درخت اس نشیب کی دیوار (دندی) میں اُگے ہوئے تھے جو اُوپر اٹھنے کی بجائے زمین کے متوازی ہو گئے تھے۔

اچانک ہمیں گھوڑوں کے ہنہنانے اور کُتوں کے بھونکنے اور غرّانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کے ساتھ کسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز تھی اور ایک آدمی کی للکار سنائی دی "میرے پیچھے ہو جا۔ ڈرنا نہیں"— صاف پتہ چلتا تھا کہ کُتوں یا بھیڑیوں نے کسی پر حملہ بول دیا ہے۔

ہم سب دوڑ کر اُس گہری جگہ کی طرف گئے اور رُک گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم اُونچے مکان کی منڈیر پر کھڑے ہوں۔ ہمارے نیچے میدان تھا جسے مٹی کی دیواروں نے تقریباً گولائی میں گھیر رکھا تھا۔ یہ دیوار جگہ جگہ سے کٹی پھٹی تھی۔ اس قسم کی جگہوں میں بھیڑیئے اور گیدڑ وغیرہ رہتے تھے۔ یہ دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اشرف ایک بھیڑیئے سے لڑ رہا تھا۔ بھیڑیا پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور اس کے اگلے پنجے اشرف کے سر تک پہنچے ہوئے تھے۔ اشرف نے بھیڑیئے کی شہ رگ پکڑ لی۔ اُس کی بیوی بھیڑیئے کے پیچھے ہو گئی اور بھیڑیئے کی دُم پکڑ کر زور سے پیچھے کھینچی۔ بادامی رنگ کی ایک کُتیا تھی جو لڑکی پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتی تھی اور لڑکی اُسے لات مار کر پرے کر دیتی تھی۔

دونوں گھوڑے دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے، رُکتے اور پھر دوڑ پڑتے تھے۔ وہ بدک گئے تھے اور ڈر سے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ لڑکی نے بھیڑیئے کی دُم کو کھینچا اور ایک طرف ہو کر بھیڑیئے کے پہلو میں بڑی زور سے کک ماری۔ بھیڑیا اشرف سے الگ ہو کر پیچھے مُڑا۔ لڑکی نے اُس کی دُم چھوڑ دی اور تیزی

سے پیچھے ہٹی۔ بھیڑئیے نے اُسے دبوچنے کے لیے اگلی ٹانگیں اٹھائیں۔ اشرف نے پیچھے سے بھیڑئیے کو اس طرح اپنے بازؤوں میں جکڑ لیا جس طرح کسی آدمی کو پیچھے سے کمر سے دبوچا جاتا ہے۔ لڑکی پیچھے ہٹتے ہُوئے گر پڑی تھی۔

اشرف نے بھیڑئیے کو اٹھا کر پٹخا اور دوڑ کر لڑکی کے آگے ہو گیا۔ بھیڑیا اُٹھ کر اشرف کی طرف آیا اور اُس پر جھپٹا۔ اشرف نے پھر بھیڑئیے کی شہ رگ دبا لی۔ اشرف نے چلّا کر اپنی بیوی سے کہا — "میرے پیچھے رہنا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

لڑکی پیچھے نہ رہی۔ بھیڑئیے نے پنجے مار مار کر اشرف کی قمیض پھاڑ ڈالی تھی اور ہمیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اشرف کے بازؤوں اور سینے سے خون بہ رہا تھا۔ لڑکی نے دوڑ کر ایک پتھر اٹھا لیا جو چار پانچ سیر وزنی تھا۔ اُس نے بھیڑئیے کے پیچھے ہو کر پتھر اُس کی پیٹھ پر مارا لیکن بھیڑیا ایک طرف ہو گیا۔ لڑکی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور گر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے اُٹھی۔ اشرف نے ابھی تک بھیڑئیے کی شہ رگ پکڑی ہُوئی تھی اور اُسے گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا خیال ہے پورے دو منٹ نہیں گزرے تھے۔ ہم جیسے سُن ہو گئے تھے۔ اچانک ہمارے کسی ساتھی کی للکار سنائی دی — "تم تماشہ دیکھ رہے ہو؟ کتّوں کو نیچے پھینکو۔ یہ تو انسان ہیں۔"

ہم سب بیدار ہو گئے۔ ہم اُوپر ہی اُوپر آگے کو دوڑے۔ ایک جگہ ذرا سی ڈھلان نظر آ گئی۔ وہاں سے اُترنا گرنے والی بات تھی لیکن ہم نے کُتّوں کی زنجیریں کھول کر انہیں ڈھلان سے دھکیل دیا۔ وہ بھیڑئیے کو دیکھ کر پہلے ہی زنجیریں کھینچ رہے تھے۔ ہم ان کے پیچھے اس طرح اُترے کہ لڑھکتے ہوئے نیچے گئے۔ جتنی دیر میں ہم سنبھلتے تھے اور اٹھتے تھے اتنی دیر میں کُتّے بھیڑئیے کو گھیرے میں لے چکے تھے اور بھیڑیا اکیلا دس کتّوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم پہنچ گئے اور کُتّوں کو للکارنے لگے۔ اشرف کو ہم نے دیکھا۔ اس کے

کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے اور وہ چلّا رہا تھا "کُتّوں کو پکڑ لو۔ میں اسے ہاتھوں سے مار ڈالوں گا۔" — وہ کُتّوں کی طرف دوڑا۔ میرے دو تین ساتھیوں نے اُسے پکڑ لیا۔

اتنے سارے شکاری اور خونخوار کُتّوں کے مقابلے میں اکیلا بھیڑیا کیا کر سکتا تھا۔ پانچ منٹ نہیں لگے ہوں گے کہ وہ مر گیا۔ ہم نے کُتّوں کو پکڑ لیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کُتیا کہیں نظر نہ آئی۔ بھاگ گئی ہو گی۔

اشرف اتنا زخمی ہونے کے باوجود اس طرح کتّوں کے اردگرد دوڑتا تھا جیسے اُسے کچھ بھی نہ ہُوا ہو۔ جب بھیڑیا مر گیا تو ہم نے اشرف کی بیوی کو دیکھا۔ وہ تو اشرف کی بلائیں لے رہی تھیں۔ اُس کا انداز اور اُس کی بیتابی اُس ماں جیسی تھی جس کا ننھا سا بچّہ زخمی ہو گیا ہو۔ اشرف بیوی کو اِدھر اُدھر سے دیکھ رہا تھا اور اُس سے بار بار پوچھتا تھا کہ اُسے کہاں چوٹ آئی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

جس چیز نے ہم سب کو حیران کر دیا وہ یہ تھی کہ اشرف اب جھلّوں یعنی نیم پاگلوں کی طرح نہیں بولتا تھا۔ وہ ہنستا بھی نہیں تھا۔ اُس کی زبان کا توتلا پن ختم ہو گیا تھا۔

"تم نے کُتّوں کو لا کر سارا کام خراب کر دیا" — اُس نے بالکل ہماری طرح بولتے ہوئے کہا — "میں اس کی شہ رگ اس لیے پکڑتا تھا کہ اس کا منہ کُھل جائے اور میں اس کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کی زبان جڑ سے پکڑ لوں لیکن یہ شہ رگ چھڑا لیتا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں اسے مار لوں گا۔"

ہم نے اُس کے بازو دیکھے۔ کندھے سے کلائیوں تک بھیڑئیے نے اُس کے بازو چھیل ڈالے تھے۔ سینے پر بھی پنجے گہرے لگے تھے۔ بھیڑئیے کا منہ کہیں نہیں پڑا تھا ورنہ وہاں سے گوشت نکال دیتا۔ ہم نے اُس کی پھٹی ہُوئی قمیض اتار دی۔ دو تین لڑکوں نے پگڑیاں کھولیں اور اشرف کے دونوں بازؤوں اور سینے کے گرد کس کر باندھ دیں۔ اُس کی بیوی اپنا دوپٹہ دے رہی تھی جو ہم نے نہ لیا۔ اشرف کو دیکھ دیکھ کر اُس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

"او پاگل لڑکی!" — اشرف نے ہنس کر کہا — "روتی کیوں ہے؟ یہ کوئی زخم ہیں؟"

ہم نے اُس میں تبدیلی یہ دیکھی کہ اس کی ہنسی نارمل آدمیوں جیسی تھی اور اُس کا لہجہ جوانمردوں جیسا تھا۔

ہم نے اُسے کہا کہ اُس کا گاؤں اگر دُور ہے تو ہم اُسے اپنے گاؤں لے چلتے ہیں۔

"کیا بات کرتے ہو بھائیو!" — اُس نے کہا — "میں اکیلا اپنے گاؤں تک پہنچ سکتا ہوں لیکن میں تم سب کو اپنے گاؤں ضرور لے جاؤں گا۔ آج رات تم میرے مہمان ہو گے۔"

"تم سب ساتھ چلو" — اُس کی بیوی نے کہا — "اسے اکیلا نہ جانے دو۔"

یہ تو ہم خود بھی محسوس کر رہے تھے کہ اسے اکیلا نہیں جانا چاہیئے لڑکی اُس وقت میرے قریب کھڑی تھی۔ اُس نے اپنے قریب کھڑے ہمارے ایک ساتھی افضل سے کہا — "کیا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ (اشرف) صحیح طرح بول رہا ہے؟"

وہ اور زیادہ یعنی پوری طرح صحیح نظر آ رہا تھا۔ اُس کی بیوی حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

ہم اشرف کو گھوڑے پر بٹھانے لگے تو اُس نے کہا کہ پیدل چلے گا۔ اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ہم سب پیدل چلیں اور وہ گھوڑے پر سوار ہو۔ ہم نے اُسے سوار کرا دیا۔ اُس کی بیوی کو دوسرے گھوڑے پر بٹھایا اور چل پڑے۔ ہمارے تین چار ساتھیوں نے لمبی گھاس اکھاڑ کر اس سے بھیڑئیے کے پاؤں باندھ دیئے تھے۔ ہمارے ساتھ دو تین لمبے اور مضبوط ڈنڈے ہو تے تھے۔ لڑکوں نے ایک ڈنڈہ بھیڑئیے کی ٹانگوں میں سے گذارا اور ڈنڈے کے دونوں سرے پکڑ کر اسے اٹھا لیا۔ وہ کہتے تھے کہ اشرف کے گاؤں والوں کو دکھائیں گے کہ ہم نے بھگیاڑ (بھیڑیا) مارا ہے۔

راستے میں اشرف اچھی بھلی باتیں کرتا رہا۔ مجھے شک ہُوا کہ پہلے وہ

ہمیں بیوقوف بنانے کے لیے ایکٹنگ کرتا رہا ہے۔ وہ ایک بار بھی پاگلوں کی طرح نہ ہنسا۔ اب اُس کی کوئی حرکت پاگلوں جیسی نہیں تھی۔

اُس کے گاؤں میں داخل ہوئے تو گاؤں میں شور بپا ہو گیا۔ گاؤں کی آبادی باہر نکل آئی۔ اُس کے گھر سے ابھی ہم کچھ دُور ہی تھے کہ اُس کی ماں دوڑتی آئی۔ اُسے دیکھ کر اشرف گھوڑے سے کُود کر اُترا۔ اُس کی ماں کی جو حالت ہُوئی اُس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ماں تو اُسے ابھی تک دودھ پیتا بچہ سمجھتی تھی۔ اُسے وہ خون میں نہایا ہُوا دیکھ رہی تھی۔ وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں بے جی!" — اشرف نے اپنی ماں سے کہا — "معمولی سے زخم ہیں۔ میں آدمی ہوں، بچّہ تو نہیں ہوں۔"

اُس کی ماں کو جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ وہ حیرت سے اپنے بیٹے کو دیکھنے لگی۔ اشرف کو صحیح آدمیوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ کر سبھی حیران ہو رہے تھے۔

گاؤں کے سیانے کو بُلایا گیا۔ اُس نے زخموں سے میرے دوستوں کی پگڑیاں کھولیں اور اپنی مرہم پٹی کرنے لگا۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہی ایک شور تھا — "اشرف اور اُس کی دُلہن پر بھیڑئیے نے حملہ کیا ہے۔ یہ لڑکے بھیڑئیے کو مار لائے ہیں۔"

مرا ہُوا بھیڑیا اشرف کے گھر کے باہر پڑا تھا۔ ہم ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے۔ کسی نے ہمیں کہا کہ باہر آؤ۔ ہم باہر گئے تو بھیڑئیے کے اردگرد پانی بہہ رہا تھا۔ گاؤں والوں نے بھیڑئیے کو نہلا دیا تھا۔

"اِدھر آؤ لڑکو!" — ایک بوڑھے نے کہا — "اسے بھیڑیا کہتے ہو؟.. یہ تو کُتّا ہے" — اور اُس نے ہمیں کُتّے اور بھیڑئیے کا فرق بتانا شروع کر دیا۔

بھیڑئیے یا کُتّے پر پانی اُسی نے ڈلوایا تھا کہ خون صاف ہو جائے اور پتہ چل سکے کہ یہ کیا ہے۔ دو اور بزرگوں نے بھی کہا کہ یہ کُتّا ہے اور بھیڑئیے کی نسل سے ہے۔ بہرحال اشرف کے ماں باپ نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ اُن کا بیٹا ٹھیک ہو گیا ہے۔ وہ ہمیں رات رکھنا چاہتے تھے لیکن ہم نہ رُکے۔ اشرف ہمیں نارمل آدمیوں کی طرح ملا اور ہم آ گئے۔

دس گیارہ دنوں بعد اشرف ہمارے گاؤں آیا۔ اُس کا باپ، ایک چچا اور ماں اُس کے ساتھ تھے۔ میں انہیں اپنے گھر لے گیا۔ میرے دوست بھی آ گئے اور اشرف ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ بزرگ الگ بیٹھ گئے۔

وہ شام سے کچھ دیر پہلے گئے۔ ہمیں اپنے بزرگوں سے پتہ چلا کہ اشرف کا باپ کیا باتیں کرتا رہا ہے۔ اشرف کے متعلق اُس نے وہی بات سنائی جو اشرف کی بیوی نے ہمیں سنائی تھی۔ اشرف کے باپ نے ہمارے بزرگوں کو بتایا کہ انہیں خدا نے یہ بیٹا بڑی منتوں اور دعاؤں کے بعد دیا تھا لیکن اس کے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا۔ اُس کے ماں باپ ایک بار پھر پیروں کے ہاں جانے لگے تھے۔ وہ اشرف کو دُور سے تعویذ لا کر گھول کر پلاتے تھے لیکن لڑکے پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ خدا نے اُسے اچانک ٹھیک کر دیا۔

اشرف کے باپ نے بتایا کہ جسے ہم بھیڑیا سمجھتے رہے ہیں وہ کُتا تھا۔ یہ کُتا دو آدمیوں نے پہچان بھی لیا تھا۔ اُن کے گاؤں سے پانچ چھ میل دُور ایک اور گاؤں تھا۔ وہاں کے ایک آدمی نے خانہ بدوشوں سے یہ کُتا خریدا تھا۔ کُتا خونخوار نکلا۔ پہلے تو اس نے گھر کے ایک آدمی کو کاٹ کھایا۔ مالک نے کُتے کی ٹریننگ شروع کر دی۔ چند دنوں بعد اُسے باہر نکالا تو وہ ایک بکری پر جھپٹ پڑا، پھر اُس نے دو اور آدمیوں کو کاٹا۔ گاؤں والوں نے اسے کہا کہ یہ کُتا بھیڑئیے کی نسل کا ہے، اسے مار ڈالو یا کہیں دُور چھوڑ آؤ۔

مالک وہاں گیا جہاں خانہ بدوشوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا لیکن وہ جا چکے تھے۔ وہ کُتے کو ساتھ لے گیا اور اُس جگہ چھوڑ آیا جہاں ہم نے اسے مارا تھا۔ اس کے آگے ذبح کی ہوئی دو مرغیاں بھی پھینک آیا۔ یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ جو کُتیا اُس کے ساتھ تھی وہ کہاں سے آ گئی تھی۔ کُتا وہیں رہا۔ وہ آدھا بھیڑیا اور آدھا کُتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس پر بھیڑئیے کی فطرت غالب آ گئی تھی۔

ویسے نہیں تو ایسے سہی

میرا پہلا بچہ آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ چھ سات میل دُور ایک گاؤں میں ہماری برادری کا ایک آدمی فوت ہو گیا۔ اطلاع آئی تو والد صاحب نے مجھے کہا کہ وہاں جانا ضروری ہے، میں ماں کے ساتھ چلا جاؤں۔ ایک گھوڑی اپنی تھی، دوسری ایک دوست کی لے لی اور ہم دونوں چلے گئے۔

جنازے کے فوراً بعد ہم واپس چل پڑے۔ سُورج غروب ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ دیہات میں یہ رواج ہُوا کرتا تھا کہ ماتم والے گھر میں کھانا کھانے کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ برادری کے کسی گھر میں مہمانوں کے کھانے کا انتظام ہُوا کرتا تھا، پھر بھی بعض مہمان کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ہمیں کھانے کے لیے روکا گیا تھا۔ میری ماں نہ مانی اور ہم چل پڑے۔ سارا دن کچھ کھایا نہیں تھا۔ میں نے راستے میں ماں سے کہا کہ یہ عجیب رواج ہے۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے، مہمانوں کا اس میں کیا قصور ہوتا ہے کہ انہیں بھُوکا رکھا جاتا ہے۔

"روزے بھی تو رکھتے ہو نا صابو!" ماں نے ہنستے ہوئے کہا ——
"تمہارا باپ تم سے زیادہ چالاک ہے۔ اسی لیے تو وہ میرے ساتھ نہیں آیا کہ بھُوکا رہنا پڑے گا۔ اُسے وقت پر روٹی نہ دوں تو مجھے کھانے کو آ جاتا ہے .... راستے میں کوئی رہٹ بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں کسی رہٹ کا پتہ ہو تو اُدھر چلے چلو۔ دو پیسے دے کر گاجر مولی کھا لینا۔"

میں نے ماں سے کہا کہ گھر چل کر ہی کھائیں گے۔ ماں نے اپنی گھوڑی کی لگام کو ہلکا سا جھٹکا دیا، ہلکی سی ایڑ لگائی اور گھوڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی

گھوڑی کی رفتار تیز کر لی لیکن علاقہ میدانی نہیں تھا۔ آگے گھاٹی آگئی جو نیچے برساتی نالے میں اُترتی تھی۔ نالے میں ریت تھی اور پتھر تھے۔ سامنے ایک اور گھاٹی تھی جس سے ہمیں اُوپر جانا تھا۔ گھوڑیوں کی رفتار تیز رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

ماں نے میری بیوی اور بچوں کی بڑی پیاری پیاری باتیں شروع کر دیں، پھر اُس نے میرے بچپن کی باتیں سنائیں کہ میں کس طرح توتلی باتیں اور شرارتیں کیا کرتا تھا۔ بڑی پیاری باتیں تھیں جو مجھے سُنا کر ماں میری توجہ بھوک سے ہٹا رہی تھی۔ ماں بہت حد تک کامیاب تھی۔

برساتی نالے میں سے گزر کر ہم اُوپر چڑھ آئے تھے۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا۔ دو تین فرلانگ آگے ایک پگڈنڈی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پگڈنڈی کے کنارے بڑ کا جو گھنا درخت تھا وہاں ایک گھوڑی ابھی ابھی رُکی تھی۔ گھوڑی پر ایک عورت سوار تھی اور باگ ایک آدمی نے پکڑ رکھی تھی۔ عورت گھوڑی سے اُتری۔ آدمی نے گھوڑی کی زین کے ساتھ بندھا ہُوا تھیلا اُتارا اور دونوں بڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔

اتنی دیر میں ہم اُن کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے اُس آدمی کو دیکھا۔ اُس زمانے کے مطابق وہ خوبصورت جوان تھا۔ اُس زمانے میں مردوں کی خوبصورتی چہرے کے خدوخال سے نہیں بلکہ جسم کی ساخت اور قد سے ناپی جاتی تھی۔ اِس آدمی کا قد اُونچا اور کندھے چوڑے تھے۔ چہرہ بھرا ہُوا اور اچھے رنگ کا تھا۔ شلوار قمیض لٹھے کی تھیں جو خوشحالی کی نشانی تھی۔ اُس کی عمر پچیس سال کے قریب ہوگی۔

اُس کے ساتھ جو عورت تھی، وہ صحیح معنوں میں خوبصورت تھی۔ اُس کی عمر بائیس تیئس سال ہوگی۔

دونوں چہرے مجھے جانے پہچانے سے لگے۔ اُس آدمی کے متعلق کچھ شک تھا۔ عورت کا چہرہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری گھوڑی خود ہی اُن کے قریب جا کر رُک گئی تھی یا میں نے روکی تھی۔ میری ماں نے بھی گھوڑی روک لی تھی۔ میں اُن دونوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"گھوڑی سے اُترو نا یار!" — اُس آدمی نے ہنستی ہوئی سی آواز میں کہا — "یا ہم سے کوئی قصور ہو گیا ہے!"

میں نے عورت کو پہچان لیا۔ ماں سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے گھوڑی سے اُتر آئے۔ ہم دونوں اُتر کر اُن کے پاس بیٹھ گئے۔ تب میں نے اس جوان آدمی کو بھی پہچان لیا اور اُسے کہا کہ اُس نے مجھے نہیں پہچانا۔ اُس نے یاد کرنے کے لیے ماتھے پر شکن ڈالے اور مسکرا کر اُس نے سر ہلایا کہ اُسے میرا چہرہ یاد نہیں آ رہا۔

"اتنے چہروں میں تم میرا چہرہ یاد بھی کس طرح رکھ سکتے تھے" — میں نے کہا — "ہم بارہ تیرہ لڑکے تھے۔ آٹھ نو کُتے تھے.... چھ سال بھی تو گزر گئے ہیں نا!"

اُس کی آنکھیں یوں ٹھہر گئیں جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ میری طرف لپکا اور اُس نے ایک بازو میری گردن میں ڈال کر منہ میرے منہ کے ساتھ لگا دیا۔

"ہاں یار!" — اُس نے مجھ سے الگ ہو کر کہا — "اتنے سارے چہرے یاد رکھنا بہت مشکل تھا.... میرے یاروں کا کیا حال ہے؟ اور میرا جانی ٹھیک ہے نا؟"

جانی اُس کا کُتا تھا۔

"یہ؟" — میں نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا — "یہ معاملہ سیدھا ہو گیا تھا؟"

"اب یہ کانچ نہیں" — اُس نے کہا — "چاند بی بی ہے۔ دو سال جیل کاٹ کر ملی ہے" — وہ چُپ ہو گیا اور اپنے قریب رکھا ہُوا تھیلا اُٹھا کر سامنے رکھتے ہوئے بولا — "بڑا مزیدار قصہ سناؤں گا۔ ساتھ ساتھ روٹی بھی کھائیں گے۔"

اچانک بھوک جاگ اُٹھی۔ اُردو بولنے والے کہا کرتے ہیں کہ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے لیکن میرے پیٹ میں گیدڑ کے پیچھے کُتے دوڑ رہے تھے میں نے دیہاتی آداب کے مطابق اُس کی روٹی کھانے سے انکار کیا۔ وہ اصرار کرنے لگا۔ میں دل پر پتھر رکھ کر اُس کا شکریہ ادا کر کے انکار کرتا رہا۔

"مجھے تمہارا نام معلوم نہیں میرے دوست!" — اُس نے مایوسی کے لہجے میں کہا — "لیکن تمہارا پیار اور تمہارا احسان میری رُوح میں موجود ہے۔ مجھے وہ روٹی یاد ہے جو تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہم دونوں کو کھلائی تھی۔ چھ سال گزر گئے ہیں" — اُس نے میری ماں کی طرف دیکھا اور کہنے لگا — "ماں جی! مجھ پر اور اس (چاند بی بی) پر وہ وقت بڑی مصیبت کا وقت تھا۔ تمہارے بیٹے نے

اور اس کے ساتھیوں نے ہم دونوں پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اب میں تم دونوں کو زبردستی روٹی کھلاؤں گا۔ ہم روٹی کھانے کے لیے رُکے ہیں"۔

اُس نے تھیلے میں سے کپڑا نکال کر کھولا۔ بہت سارے پراٹھے تھے۔ ان پر مٹی کا بڑا سارا پیالہ رکھا تھا۔ اس میں بھنی ہوئی مرغی تھی۔ اُس نے اشارہ کیا اور میں ٹوٹ پڑا۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ہم چاروں نے سیر ہو کر کھایا —— میرے پیٹ میں جو کُتّے گیدڑ کے پیچھے دوڑ رہے تھے، وہ بہت دُور چلے گئے پھر واپس نہ آئے۔

"تمہیں میرا نام معلوم نہیں"—— میں نے اُسے کہا ——"اور مجھے تمہارا نام معلوم نہیں.... میرا نام صابر حسین ہے"۔

"میرا نام علی شان ہے"—— اُس نے کہا اور ہنس پڑا ——"علی شان نام اُس وقت تھا جب میں شریف اور کمزور سا لڑکا تھا۔ اب مجھے شانا بدمعاش کہتے ہیں۔ اب مجھے کوئی بھی کمزور نہیں سمجھتا"۔

چھ سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ شخص شانا ہمیں اس طرح ملا تھا جس طرح گیدڑ اور خرگوش ملا کرتے تھے۔ ہم بارہ تیرہ لڑکے آٹھ نو کُتّے ساتھ لیے حسبِ معمول شکار کو نکلے تھے۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ موسم بہار کا جوبن تھا۔ گندم کی فصل جوان ہو گئی تھی۔ اس میں سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں کا حُسن اور ان کی مہک خمار سا طاری کر رہی تھی۔ ہم اُس وقت نوجوان تھے۔ میں اُس وقت نوجوان نہیں تھا کہ میرا پہلا بچہ دو سال کا ہو گیا تھا۔ میرا دل نوجوان تھا لیکن میری بیوی اپنے بچے سے یہ کہہ کر کہ جا اپنے باپ کے پاس، مجھے بوڑھا کہہ دیا کرتی تھی۔ میں اکیس برس کی عمر میں باپ بن گیا تھا۔ اب میری ماں مجھے ڈانٹتے ہوئے یہ ضرور کہا کرتی تھی ——"شرم کر صابو! اب تُو بال بچے دار ہو گیا ہے"۔

مجھے بہت عرصے بعد شرم آنی شروع ہوئی تھی۔

صبح ہمیں شکار کو نکلنا تھا اور رات کو ماں مجھے شرم دلا رہی تھی۔ میں نے ماں سے بڑا پکا وعدہ کیا کہ کل کا دن مہلت دے دے، پرسوں سے شرم کرنی شروع کر دوں گا۔ ماں راضی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے ایک پیر کے باپ دادا کے "رُوضے" کی قسم کھائی کہ پرسوں صبح مجھے شرم نہ آئی تو مجھے "رُوضہ شریف" سزا دے۔

ماں تڑپ اُٹھی اور اُس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ یہ اُس کی نگاہ میں بہت بڑی قسم تھی۔ ماں اور اُس کے میکے کا سارا خاندان اُس پیر کا مرید تھا اور میں اس پیر کو مست بھینسا کہا کرتا تھا۔ بڑا کامیاب فراڈیا تھا۔ میں نے ماں سے اور اپنی بیوی سے الیکشن میں کھڑے ہونے والے سیاسی لیڈروں جیسا وعدہ کر کے انہیں موم کر لیا۔

اُس روز ہم اپنے ایک دوست کی فرمائش پر شکار پر جا رہے تھے۔ اس دوست کا نام ارشاد تھا۔ شادا کہلاتا تھا۔ اپنے والد صاحب کے ساتھ وہ دُور کے رشتہ داروں کے گاؤں گیا تھا۔ یہ گاؤں ہمارے گاؤں سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔ شادا وہاں سے بڑی اچھی نسل کا ایک کُتّا خرید لایا تھا۔ یہ کُتّا بِلی جُبلی نسل کا (کراس بریڈ) تھا۔ شادا ہمیں کہتا تھا کہ وہ کُتّے کو شکاری بنانا چاہتا ہے۔ شکار کے لیے کُتّے کو ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔

نئے کُتّے کو شکاری کُتّوں کی ٹیم کے ساتھ لے جانا اس لیے نقصان دہ ہوتا ہے کہ کُتّے اُسے قبول نہیں کرتے۔ اُسے سب سے پہلے کُتّوں سے مانوس کرنا پڑتا ہے۔ شادے کا کُتّا اِس مرحلے سے گزر چکا تھا۔ گاؤں کے تمام شکاری کُتّوں کے ساتھ اُس کا تعارف ہو چکا تھا۔ افضل کے بُوہلی نے اُسے اچھی خاصی پھینٹی لگا کر ذہن نشین کرا دیا تھا کہ لیڈر کون ہے۔ شادے کے کُتّے نے مقابلہ تو خوب کیا تھا لیکن کسی بھی کُتّے نے اُس کی حمایت نہیں کی تھی۔ سب الگ کھڑے تماشہ دیکھتے رہے تھے۔ بہرحال شادے کے کُتّے کا یہ فخر قائم رہا کہ وہ بلا مقابلہ نہیں ہارا۔ بُوہلی کی لیڈر شپ تسلیم کر کے اس نئے کُتّے نے تمام کُتّوں کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا تھا جیسے انہیں کہہ رہا ہو کہ تم سب چمچے ہو۔

ہم کُتّوں کو ٹہلائی کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ شادے کا کُتّا ساتھ ہوتا تھا۔ وہ جب پوری ٹیم سے مانوس ہو گیا تو ایک روز ہم شکار کو نکلے اور خاصی دُور نکل گئے۔ قریب کے علاقے میں اب شکار نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ہمارے کُتّوں کی وجہ سے ہمارا شکار دُور چلا گیا تھا۔ ہم کھڈنالوں کے ویران علاقے میں گئے تو کسی نشیب سے ایک خرگوش نکلا۔ وہ اتنی تیز دوڑ رہا تھا جیسے اُڑ رہا ہو۔ وہ ہم سے کوئی دو سو

گز دُور تھا۔ اُس کے پیچھے کھڈ میں سے ایک کُتا نکلا جو کُتا نہیں بھیڑیا لگتا تھا۔ ہم اُسے بھیڑیا ہی سمجھے تھے۔

خرگوش ایک طرف کو مُڑ گیا۔ کُتا اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اُس کی آواز پر ہمارے کُتوں نے اُدھر دیکھا۔ وہ سب کُھلے ہوئے تھے۔ اشارے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تمام کُتے "لف لف" کی آوازیں نکالتے ہوا ہو گئے۔ وہ کُتا یا بھیڑیا خرگوش تک پہنچ گیا اور اُس نے خرگوش کو پکڑ لیا۔ کوئی عام کُتا خرگوش کو اس طرح نہیں پکڑا کرتا جس طرح اُس نے پکڑا اور اب اُسے بھنبھوڑ رہا تھا۔

ہمارے کُتے اتنی تیزی سے پہنچے کہ اِس کُتے کو سنبھلنے کی مہلت نہ ملی۔ وہ اپنے شکار میں مگن تھا۔ جس طرح ہم اُسے بھیڑیا سمجھے تھے اس طرح کُتے بھی اُسے بھیڑیا سمجھے ہوں گے۔ وہ سب اُس پر ٹُوٹ پڑے۔ وہ اکیلا آٹھ نو کُتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔ بڑا ہی خونخوار تھا۔ ہمارے جس کُتے کو اُس نے منہ ڈالا اُس کی تو اُس نے چیخیں نکال دیں۔

ہمیں عورتوں کا شور سُنائی دیا۔ دو جوان عورتیں چیختی چلاّتی دوڑی آ رہی تھیں۔ وہ گالیاں دے رہی تھیں اور ہمیں کہہ رہی تھیں کہ ہم کُتوں کو پکڑیں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ بھیڑیا نہیں کُتا ہے۔ وہ عورتیں ہمارے دیہات کی نہیں، خانہ بدوش تھیں۔ میں نے آپ کو اپنی پہلی کہانیوں میں سنایا ہے کہ اُس زمانے کے خانہ بدوش آج کل کے خانہ بدوشوں کی طرح نہیں تھے جو شہروں کے قریب پھٹے پُرانے کپڑوں کے خیمے بنا کر ان میں رہتے ہیں۔ یہ خانہ بدوش شہروں میں گندے کپڑے اور کاغذ وغیرہ اکٹھے کرتے رہتے ہیں۔

اُس زمانے کے خانہ بدوش بڑے سخت لوگ ہوتے تھے۔ اُن کے باقاعدہ قبیلے تھے۔ ان میں جرائم پیشہ بھی تھے۔ اُن کی اپنی الگ تھلگ دنیا تھی اور انہوں نے اپنے قانون اور ضابطے بنا رکھے تھے۔ ان کی عورتیں خوبصورت اور سخت جان ہوتی تھیں۔ اُن کا لباس اپنی ہی قسم اور طرز کا ہوتا تھا۔ ان کے پاس بڑے خونخوار کُتے ہُوا کرتے تھے۔ بالکل بھیڑئیے لگتے تھے۔ ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ اُن کے کُتے ہوتے ہی بھیڑئیے کی نسل سے تھے۔ وہ کُتا جس پہ ہمارے کُتے ٹُوٹ پڑے تھے، ان کا کُتا تھا۔

ہم نے اپنے کتوں کو بڑی مشکل سے پکڑا اور پیچھے کیا۔ اُن کا کُتا ہولناک چیخیں مارتا اتنی تیز دوڑا کہ ایک خانہ بدوش عورت کی ٹانگوں سے ٹکرایا۔ وہ عورت بُری طرح گری اور کُتا جس نشیب سے برآمد ہُوا تھا، اُسی میں غائب ہو گیا۔ اُس کی دردناک چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ ان خانہ بدوشوں کا ڈیرہ کہیں قریب ہی تھا۔ یہ دو عورتیں کُتے کو ساتھ لے کر کہیں جا رہی تھیں۔ کُتے کو خرگوش نظر آ گیا اور وہ شکار کھیلتے کھیلتے ہمارے کُتوں کا شکار ہو گیا۔

خرگوش ابھی زندہ تھا۔ کُتے جب خانہ بدوشوں کے کُتے کے ساتھ مصروف تھے، اُس وقت خرگوش لنگڑاتا ہُوا میدانِ جنگ سے جا رہا تھا۔ خانہ بدوشوں کے کُتے نے اُسے زخمی کر دیا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے خرگوش کو پکڑ لیا۔ خانہ بدوش عورتیں ابھی تک ہم پر غصہ نکال رہی تھیں اور ہم ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھی کے پاس خرگوش دیکھ لیا۔ ایک عورت بڑی تیزی سے اُس تک گئی اور خرگوش پر جھپٹا مارا۔ کہنے لگی کہ یہ اُن کے کُتے کا شکار ہے۔ دوسری عورت بھی اُس پر جھپٹ پڑی۔

ہم میں سے کسی نے کہا کہ خرگوش کو پھینک دو، یہ خود پکڑ لیں گی۔ ہمارا ساتھی اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے خرگوش دُور پھینک دیا۔ اُدھر دونوں عورتیں خرگوش کی طرف دوڑیں اِدھر ہم نے کُتوں کے پٹّوں سے زنجیریں نکال دیں۔ کُتے عورتوں کے ساتھ ہی خرگوش تک پہنچ گئے اور انہوں نے خرگوش اُڑا لیا۔ عورتیں کتّوں کی لپیٹ میں آ کر قلابازیاں کھانے لگیں اور اُٹھ کر اپنے کُتے کی طرح بھاگ گئیں۔

ہمیں شکار کا لطف آ گیا۔ ہم راجے، مہاراجے اور نواب نہیں تھے جو ہرن اور ہڑیال کے شکار کے لیے نکلا کرتے تھے۔ یہ نوجوان خون کا جوش تھا جو ہمیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔

شادے کو اطمینان ہو گیا کہ اُس کا کُتا ٹیم کا ممبر بن گیا ہے اور یہ شکار کے لیے موزوں ہے۔ لڑکوں نے کہا کہ اور آگے چلو۔ ہم آگے چل پڑے اور کچھ دیر بعد ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو بالکل ویران اور بیابان تھا۔ اس علاقے میں سے کبھی ہم ہی گزرے ہوں گے، اور کسی کے گزرنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ وہ علاقہ ڈاکوؤں

اور رہزنوں کے چھپنے کے لیے موزوں تھا۔

ہم ایک برساتی نالے (کَسّی) میں سے گذر رہے تھے۔ اِس کے دونوں کنارے بہت اُونچی دیواروں جیسے تھے۔ کُتے کھُلے ہوئے تھے اور اِدھر اُدھر بکھر کر زمین کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ نالے میں پار جانے کے لیے ایک گھاٹی تھی جو ڈیڑھ دو سو گز آگے تھی۔ ہم ریت اور پتھروں پر چلتے اُدھر جا رہے تھے۔ جب ہم گھاٹی چڑھنے لگے تو شادے نے اپنے کُتے کو پکارا۔ اُسے اپنا کُتا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شادا گھاٹی چڑھتے چڑھتے نیچے چلا گیا اور اپنے کُتے کو پکارنے لگا۔ باقی کُتے ہم سے آگے گھاٹی چڑھ گئے تھے۔

شادا نیچے تھا، ہم اُوپر جا رہے تھے۔ کُتے کو پکارتے پکارتے شادے نے کہا — "اُدھر نیچے آؤ ذرا" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُس نے کوئی ڈراؤنی یا عجیب چیز دیکھی ہو۔

میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ گھاٹی اُتر گیا۔ شادے نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا — "میرا کُتا بار بار وہاں اندر جاتا ہے۔ آؤ چل کے دیکھیں"۔

پچیس تیس قدم دُور کَسّی کے دیوار جیسے کنارے کے ذرا آگے مٹی کا بہت بڑا تودہ تھا جو دس بارہ فٹ اُونچا اور اس سے ذرا زیادہ لمبا ہوگا۔ یہ مٹی کی دیوار (دَندی) سے کوئی ایک قدم ہٹا ہُوا تھا۔ اس کے پیچھے دَندی میں شگاف ہوگا۔

ہمیں کُتے کی اس طرح کی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ کھیل رہا ہو یا کسی سے پیار محبت کر رہا ہو۔ وہاں کوئی کُتیا ہو سکتی تھی لیکن کُتیا ہوتی تو تمام کُتے اُس کی مُشک پر وہاں پہنچے ہوئے ہوتے اور ان میں نفاق پیدا ہو چکا ہوتا۔

ہم آہستہ آہستہ اُدھر چلے تو کُتا باہر آیا اور اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کا ایک بازو پُورا اور جسم کا تھوڑا سا حصّہ نظر آیا۔ وہ آدمی کُتے کو باہر دھکیل رہا تھا اور کُتا پیار کے اظہار کی آوازیں نکالتا ہُوا پھر اندر چلا گیا۔ ہم تیز تیز آگے چلے گئے۔ ہمارے باقی ساتھی بھی نیچے آ گئے اور دو تین کُتے بھی آ گئے۔

اس سے پہلے میں آپ کو اس سے ملتے جلتے واقعات سُنا چکا ہوں۔ ایک بار چھُپے ہوئے ایک ڈاکو سے ملاقات ہو گئی تھی۔ ایک بار اسی قسم کی جگہ چھُپی ہوئی

ایک جوان لڑکی ملی تھی۔ ایک بار ایک کشادہ بِل میں ایک لڑکا چھپا ہُوا ملا تھا جسے ہمارے کتّوں نے باہر نکالا تھا۔ یہ واقعات شاید آپ کے لیے عجیب اور شاید ناقابلِ یقین بھی ہوں، لیکن ہمارے لیے ان واقعات میں حیرت انگیز کوئی بات نہیں۔ وہ جگہیں آبادیوں سے اور گذرگاہوں سے دُور تھیں۔ وہاں گہرے کھڈ اور کشادہ نشیب تھے۔ مٹی کے ٹیلے تھے۔ قلعوں کی مانند مٹی کی اُونچی دیواریں تھیں۔ ان میں بعض جگہیں ہیبت ناک سی تھیں جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں چڑیلیں اور بدرُوحیں رہتی ہیں۔ لوگ سچ مانا کرتے تھے۔

یہ جگہیں مجرموں کے لیے اور گھروں سے بھاگنے والی عورتوں کے لیے نہایت اچھی اور موزوں تھیں۔ وہاں انہیں پکڑنے کوئی نہیں جاتا تھا۔ کوئی اُدھر سے گذرتا ہی نہیں تھا۔ ہم شکار کے جنون میں ان جگہوں میں بھی جا گھُستے تھے جن کے متعلق لوگ پُورے یقین سے کہتے تھے کہ وہاں جن بھوت اور چڑیلیں رہتی ہیں۔ انوکھے واقعات اور عجیب و غریب کردار آپ کو گھر آ کر تو نہیں ملیں گے۔

اب پھر ایک آدمی اس ویرانے میں چھپا ہُوا تھا۔ وہ آدمی ہی لگتا تھا لیکن کُتا اُس کے ساتھ پیار کیوں کر رہا تھا؟ —— کچھ بھی تھا، ہم دلیری سے آگے بڑھے۔ اس سے پہلے ہمارے ساتھ ایسے دو واقعات ہو چکے تھے۔ وہ انسان ہی نکلے تھے۔ جن بھوت نہیں تھے۔

شادے کا کُتا پھر اندر چلا گیا۔ ہم قریب پہنچ چکے تھے۔ اندر سے آواز آ رہی تھی —— "جا، جانی! دفع ہو جا یہاں سے" —— مگر جانی پیار کی آوازیں نکال رہا تھا۔ ہم تودے اور دَندی کے درمیان گئے تو دَندی میں شگاف دیکھا۔ یہ شگاف بہت بڑے غار کے دہانے جیسا تھا جس میں سے ایک اُونٹ گذر سکتا تھا۔ اُوپر تو دے تنگ رہے تھے۔ ہم دوڑ کر اس شگاف میں جا رُکے۔ آگے کوئی غار نہیں تھا۔ کھُلی جگہ تھی جس کے ہر طرف مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں اور اُوپر آسمان تھا۔ ایک آدمی پیٹھ ہماری طرف کیے دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سے ایک ٹیلے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ شادے کا کُتا اُس کے پیچھے چلا گیا۔ اس کُتے کو دیکھ کر ہمارے چار پانچ کُتے یہ سمجھ کر کہ کوئی شکار ہے غرّاتے ہوئے دوڑ پڑے۔

شادے کا کُتا ٹیلے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ دوسرے کُتے وہاں پہنچے ہی تھے کہ وہ آدمی جو کہیں چھپ گیا تھا، سامنے آگیا۔ ہمارے کُتے اُس سے چند قدم دُور تھے۔ شادے کا کُتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہا تھا۔ یہ کُتا اس خیال سے ہمارے کُتوں کے مقابلے میں آگیا کہ وہ شاید اس آدمی پر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ ہمارے کُتے کسی انسان پر حملہ کرنے والے نہیں تھے۔ وہ سب رُک گئے۔ کُتے کی وفاداری دیکھئے کہ وہ اُس آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر ہمارے کُتوں پر اس طرح غصّے سے بھونکنے لگا جیسے وہ کسی کو اس شخص کے قریب نہیں آنے دے گا۔

میں حیران تھا کہ شادے کے کُتے کا اس شخص کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر شادے نے یہ کُتا اس سے خریدا ہوتا تو شادا فوراً کہتا کہ یہ کُتے کا سابقہ مالک ہے۔ ہمارے کُتوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی شکار نہیں تو وہ ویسے ہی اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے اور زمین کو سُونگھنے لگے۔ وہ آدمی آہستہ آہستہ ہماری طرف آنے لگا۔

وہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا نوجوان لڑکا تھا۔ اُس نے دیہاتی طرز کے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کی شکل وصورت اور جسم اس قابل تھا کہ کچھ دیر اُسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ سی تھی۔ ہم میں سے کسی نے اُسے کہا کہ گھبراؤ مت، آگے آجاؤ۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے ہمیں اسلام کا واسطہ دیا۔ ذرا رُک رُک کر اور قدرے ڈرے ہوئے سے لہجے میں اُس نے ہمیں جو واردات سنائی وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں ذرا اختصار سے سناتا ہوں۔

وہ جس گاؤں کا رہنے والا تھا وہ وہاں سے بارہ تیرہ میل دُور تھا۔ وہ کسی غریب خاندان کا لڑکا نہیں تھا اور اُس کا خاندان امیر بھی نہیں تھا۔ اُس کا ذریعۂ معاش کاشتکاری تھا۔ اُس کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی جب اُس کی ایک بہن کی شادی ہوئی۔ انہیں تھوڑے سے قرض کی ضرورت پڑ گئی۔ اُس زمانے میں دیہات میں ہندو ساہوکار ہوتے تھے۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار موجود تھا۔ یہ ساہوکار سُود پر قرض دیتے تھے۔ قرض کے عوض زمین یا مکان

گروی رکھ لیتے تھے۔ ان کا حساب کتاب افغان پاوندوں جیسا تھا۔ وہ سود وصول کرتے رہتے تھے اور اصل زر کم ہونے کی بجائے بڑھتا رہتا تھا۔ ہندو ساہوکار اس قسم کا حساب کتاب رکھتے تھے جسے دیہات کے اَن پڑھ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ فصل جب گھر آتی تھی تو یہ ساہوکار فصل کا خاصہ حصّہ سُود میں اُٹھا کر لے جاتے تھے۔

اس نوجوان کے باپ کے ساتھ بھی ہندو ساہوکار یہی سلوک کر رہا تھا۔ اس کا باپ بے چارہ بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ساہوکار نے ایک گائے رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے اس نوجوان کو جب اس کی عمر تیرہ چودہ سال تھی، گائے کی دیکھ بھال کے لیے اور اسے دانہ پٹھا ڈالنے کے لیے بلا معاوضہ نوکر رکھ لیا تھا۔ ساہوکار اس لڑکے سے گھر کے کچھ اور کام بھی کرا لیا کرتا تھا۔

ہندو ساہوکار کی ایک بیٹی تھی جس کی عمر اس لڑکے سے ڈیڑھ دو سال کم تھی۔ لڑکی کو اس لڑکے کی عادتیں اتنی اچھی لگیں کہ وہ اس میں گھُل مِل گئی۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ لڑکی کے ماں باپ نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کہ وہ اس لڑکے کے ساتھ گھر میں ہنستی کھیلتی ہے۔ یہ لڑکا اِس لڑکی کی خاطر سارا سارا دن ساہوکار کے گھر میں گذارنے لگا۔ وہ قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ اُس کی نیّت میں ذرا سا بھی فتور نہیں تھا۔

میں اُس کے لیے قسم نہیں کھا سکتا کہ اُس کی نیّت میں فتور تھا یا نہیں۔ میں آپ کو اُس کا بیان سُنا رہا ہوں۔ ہندو ساہوکار اس نوجوان کے باپ سے سُود وصول کرتا رہا اور اُس نے اس لڑکے کو بیگار میں بھی لگائے رکھا — اور اس نوجوان کی عمر سترہ اٹھارہ سال اور لڑکی کی عمر سولہ سال ہوگئی۔ ان دونوں میں پہلے والی چاہت اور بے تکلفی قائم رہی پھر یہ محبت کی صورت اختیار کر گئی۔

ہندو اپنی لڑکیوں کی شادی چھوٹی عمر میں کر دیا کرتے تھے۔ اس لڑکی کی عمر سولہ سال ہوگئی تھی۔ قریب ہی ایک اور گاؤں تھا۔ وہاں کے ایک ہندو بنئے نے لڑکی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے لے لیا۔ لڑکی نے اپنے ہونے والے خاوند کو اچھی طرح دیکھا ہُوا تھا۔ اُس کا قد چھوٹا اور جسم بہت موٹا اور بھدّا تھا اور وہ ہندو

بنیؤں کی طرح کنجوس اور احمق تھا۔ لڑکی بہت پریشان ہوئی۔

اس مسلمان نوجوان نے ہمیں بتایا کہ لڑکی دوسری ہندو لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اُس میں ہنسنے کھیلنے اور مسلمان لڑکیوں کی طرح بھاگنے دوڑنے کی خواہش تھی۔ اُس نے اس نوجوان سے کہا کہ وہ آٹے کی بوری جیسے اس آدمی کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔ اُس نے کہا کہ وہ گھر سے پیسے چُرا لے گی اور دونوں کہیں بھاگ چلیں گے۔

نوجوانی میں جب رومانی جذبات کا غلبہ طاری ہوتا ہے تو انسان نفع نقصان کی نہیں سوچا کرتا۔ یہی حال ان دونوں کا تھا۔ نوجوان تیار ہوگیا۔ اُس کے دل میں اس ہندو ساہوکار کی نفرت بھری ہوئی تھی۔ اس نفرت میں اس کُتے نے اضافہ کر دیا جو شادے نے خریدا تھا۔ یہ کُتا اس مسلمان نوجوان کا تھا۔ یہ کُتا اس نوجوان کو اُس وقت ملا تھا جب یہ ابھی پلّا تھا۔ یہ اُسے کہیں باہر سے ملا تھا معلوم نہیں اپنی ماں سے کس طرح جُدا ہوگیا تھا۔ نوجوان نے اسے اُسی طرح پالا تھا جس طرح ماں اپنے بچّے کی پرورش کرتی ہے۔ اس نے کُتے کا نام جانی رکھا۔ کتا اپنے مالک کو ہی اپنی ماں اور اپنا باپ سمجھتا تھا کیونکہ اُس کی عمر ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوئی تھی جب یہ لڑکا اُسے اٹھا لایا تھا۔ اُس کے منہ میں اپنے ہاتھوں دودھ ٹپکاتا رہا پھر اُسے اپنے ہاتھوں کھلاتا پلاتا رہا۔

مختصر یہ کہ جانی اس لڑکے کی زندگی کا ایک حصّہ بن گیا۔ دونوں ہر وقت اکٹھے رہتے تھے۔ پھر جانی جوان ہوگیا اور اُسے پالنے والا بھی جوان ہوگیا۔ ایک روز ہندو ساہوکار نے اِس نوجوان سے یہ کُتا بلا قیمت لے لیا۔ یہ نوجوان جانی کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا لیکن اُس کے باپ نے اُسے کہا کہ بیٹا! ہم اس کافر کے مقروض ہیں، اِسے ناراض نہ کرو، ورنہ یہ سُود پر سُود لگاتا چلا جائے گا اور یہ خطرہ بھی ہے کہ ہماری جو زمین اُس کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے، وہ اِس پر قبضہ کرلے گا۔

جانی اپنے مالک سے جُدا ہوگیا۔ یہ لڑکا ہندو ساہوکار کے گھر کام کاج کرتا تھا۔ اس سے اُسے یہ فائدہ ہُوا کہ وہ دن کے وقت اپنے جانی کے ساتھ رہتا تھا۔

جانی کے لیے بھی اپنے پالنے والے کی جدائی ناقابل برداشت تھی۔ رات کو وہ عجیب طریقے سے بھونکتا رہتا تھا۔ وہ اپنے مالک کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ ہندو ساہوکار نے کُتا کسی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اُس نے بیس روپے قیمت وصول کی تھی۔ آج بیس روپے بڑی تھوڑی رقم لگتی ہے لیکن اُس دَور میں یہ خاصی زیادہ رقم تھی۔ آج کے حساب سے یہ چار سو روپے سے زیادہ بنتی ہے۔ جانی کا مالک خریدار کو نہیں جانتا تھا۔ وہ ہمارا دوست شادا تھا جو اب جانی کے نوجوان مالک کے سامنے بیٹھا تھا۔

ہندو بنیؤں کا دھرم پیسہ ہوتا ہے۔ اس ہندو ساہوکار نے یہی سوچ کر اِس لڑکے سے کُتا لے لیا تھا کہ اسے بیچ کر چار پیسے ہاتھ آجائیں گے۔ ہندوؤں کو ہم جانتے تھے۔ وہ اتنے زندہ دل اور خوش ذوق نہیں ہوتے تھے کہ اتنے خوبصورت اور اچھی نسل کے کُتے پالتے۔ وہ تو اپنے بچّوں کو بھی ترسا ترسا کر پالتے تھے۔ اس ہندو ساہوکار نے کُتا بیچنے کے لیے ہی لے لیا تھا، چنانچہ اُس نے بیس روپے کما لیے۔ اُس وقت تو یہ لالہ ان سیدھے سادے اور پسماندہ لوگوں کا اَن داتا بنا ہُوا تھا لیکن اُسے یہ خیال نہ آیا کہ ستائے ہوئے انسان جب قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو وہ ایک پیسے کا پورا روپیہ وصول کیا کرتے ہیں۔

یہ نوجوان اپنے جانی کی جدائی میں پاگل سا ہوگیا۔ اُس پر ہندو ساہوکار کی بیٹی کی محبت جنون کی طرح سوار تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ اُس گول مٹول آدمی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ ان سب باتوں نے مل کر لڑکی اور لڑکے کا دماغ خراب کر دیا۔ لڑکی کمسن تھی۔ اُس نے لڑکے کو مجبور کر دیا کہ بھاگ چلیں۔ لڑکی نے گھر سے کچھ رقم چوری کرلی اور دونوں رات کو نکل گئے۔ صبح ہوئی تو وہ اسی قسم کی ایک جگہ چھپ گئے۔ دن وہاں گزارا اور رات کو چل پڑے۔ لڑکی مسلمانوں کی ہوتی تو وہ تیز چلتی اور زمین کی اُونچ نیچ کی پرواہ نہ کرتی۔ یہ ہندوؤں کی لڑکی تھی جس نے گھر میں میٹھے پر پرورش پائی تھی۔ مسلمان لڑکیوں کی طرح اُس نے محنت مشقت کبھی نہیں کی تھی۔ وہ سنگلاخ زمین پر چل نہیں سکتی تھی۔

رات کو وہ زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکے۔ صبح ہوئی تو وہ اس جگہ چُھپ گئے۔

جب سے گاؤں سے نکلے تھے انہوں نے کچھ کھایا نہ تھا۔ بھوک نے اُن کی جان نکال لی تھی۔ اس نوجوان نے ہمیں بتایا کہ اُس نے کتّوں کی آوازیں سنیں تو آگے جا کر اور چھُپ کر دیکھا۔ اُسے ہم نظر آئے۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا جانی بھی ہمارے ساتھ ہے۔

اب میں آپ کو کُتّے کی محبت اور وفاداری کا مظاہرہ دکھاتا ہوں۔ یہ لڑکا اس جگہ سے باہر بھی کچھ دیر رہا تھا۔ اُس کا کُتّا جو اَب ہمارے ساتھ تھا اُس کی مُشک پر رُک گیا اور زمین کو سُونگھتا وہاں جا پہنچا جہاں اُسے پالنے والا چھُپا ہُوا تھا۔ لڑکے نے اُسے دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کا جانی اِن کتّوں کے ساتھ آیا ہے جنہیں اُس نے چھُپ کر دیکھا تھا۔ اب اس کے پیچھے اس کا نیا مالک آجائے گا۔ چنانچہ اُس نے جانی کو وہاں سے باہر دھکیلنا شروع کر دیا۔ جانی کو اپنا یار مل گیا تھا۔ وہ باہر آکر پھر اُس کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے۔

ہمارے کہنے پر اُس نے لڑکی ہمیں دکھائی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور معصوم سی تھی۔ اُس کے پاؤں سُوج گئے تھے۔ تھکن اور بھوک سے اُس کی حالت بہت بُری ہو گئی تھی۔ ہم اپنے ساتھ پراٹھے، انڈے اور بعض لڑکے گوشت یا مرغی پکوا کر لے جاتے تھے۔ ہم سب نے اپنا اپنا کھانا اُن کے آگے رکھ دیا اور اُنہیں کہا کہ پہلے وہ پیٹ بھر کر کھا لیں پھر ہم کھائیں گے۔ ہندو گوشت نہیں کھایا کرتے تھے، لیکن اس ہندو لڑکی نے جی بھر کے گوشت کھایا۔

میں، راجہ شاہباز اور افضل اس نوجوان کو پرے لے گئے اور اُسے کہا کہ وہ بڑی خطرناک غلطی کر رہا ہے۔ وہ اتنی خوبصورت لڑکی کو ساتھ لیے ویرانوں میں پھر رہا تھا۔ ہم اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے انہیں ہم اپنے گاؤں لے جا کر پناہ بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ لڑکی کم عمر تھی اور وہ گھر سے پیسے چُرا کر لائی تھی۔

لڑکا دلیر تھا۔ اُس نے کہا ـــ "اللہ نگہبان ہے۔ میں جہلم پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ سُنا ہے انگریز افسر بڑے رحم دل ہوتے ہیں۔ ان کے آگے عرض کروں گا کہ مجھے فوج یا پولیس میں بھرتی کر لیں اور یہ لڑکی مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس کی میرے ساتھ شادی کر کے اسے پناہ میں لے لیں۔ تم مجھ

پر صرف یہ مہربانی کرو کہ کسی کو بتانا نہیں کہ تم نے ہم دونوں کو یہاں دیکھا تھا۔ ہمارا پردہ نہ اُٹھانا"

وہ بیوقوفی کی باتیں کر رہا تھا۔ انگریز افسر اس طرح کی رحمدلی نہیں کرتے تھے کہ کمسن لڑکی کو جو ورغلا کر گھر سے نکال لائے اور گھر سے پیسے بھی چُرا لائے، اُسے پناہ میں لے لیتے۔ بہرحال ہم نے اُسے راستہ سمجھا دیا جو پکی سڑک تک جاتا تھا۔ ہم نے بہت سوچا کہ ان کی کیا مدد کریں لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہم نے اُسے یقین دلایا کہ ہم اُن کی نشاندہی نہیں کریں گے۔

ان دونوں کو ہم اللہ کے حوالے کر کے وہاں سے نکل آئے۔ ہم شکار کے لیے آگے نہ گئے۔ وہیں سے واپس آگئے۔ گاؤں تک ہم یہی سوچتے رہے کہ ان کی مدد کس طرح کی جا سکتی ہے۔ گاؤں میں ہم نے کسی سے ذکر نہ کیا کہ ہم نے کیا دیکھا تھا۔ پھر دن گذرتے گئے اور یہ واقعہ پُرانا ہو گیا اور پھر یادوں کے قبرستان میں دفن ہو گیا۔

اب وہی نوجوان اور وہی لڑکی میرے سامنے بیٹھے تھے ـــ چھ سال گذر گئے تھے ـــ اب اُنہوں نے اپنے نام بتائے۔ اس نوجوان کا نام علی شان اور لڑکی کا نام کانتی تھا لیکن اب وہ کانتی نہیں چاند بی بی تھی۔ اب علی شان جو شانا کہلاتا تھا، نوجوان نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر جوانی کی پختگی تھی اور اُس کی مردانہ خوبصورتی نکھری ہوئی تھی۔ چاند بی بی اب کمسن نہیں، بائیس تئیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر اب تھکن، خوف اور بھوک کے آثار نہیں تھے۔ وہ چھ سال پہلے کی نسبت اب زیادہ خوبصورت تھی۔ چھ سال پہلے بھوک نے انہیں ادھ مؤا کر دیا تھا اور ہم نے انہیں کھانا کھلایا تھا۔ اب میں بھوک سے مر رہا تھا، اور وہ مجھے اور میری ماں کو کھانا کھلا رہے تھے۔

"میں تمہیں اور تمہارے دوستوں کو نہیں بھولا" علی شان نے کہا ـــ "ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اگر تم ہمیں کھانا نہ کھلاتے تو یہ (لڑکی) بے ہوش ہو جاتی اور میرے لیے مصیبت بن جاتی۔ پھر تم نے ہم پر یہ احسان کیا کہ

کسی کو بتایا نہیں۔ تم نے ہماری مدد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔"

"سچی بات ہے ماں جی!" — چاندبی بی نے میری ماں سے کہا — "آپ کو تو ساری بات کا علم نہیں۔ اُس اجاڑ بیابان میں میں اکیلی تھی، یہ (شاناں) اکیلا تھا۔ یہ دس بارہ جوان لڑکے تھے۔ میں تو انہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ یہ ایسے ویسے ہوتے یا بدمعاشی پر اُتر آتے تو میرا اکیلا آدمی ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔"

"چھوڑ شالنے یار!" — میں نے اُسے کہا — "ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ تم مجھے یہ قصہ سناؤ کہ آگے کیا ہوا تھا۔ تمہیں دو سال جیل کس طرح کاٹنی پڑی تھی۔"

"تم نے پکی سڑک تک پہنچنے کا جو راستہ مجھے سمجھایا تھا، اُس سے میں بھٹک گیا تھا" — علی شان نے کہا — "ساری رات کھڈوں، نالوں اور ٹیلوں میں چلتے اور گھاٹیاں اُترتے چڑھتے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو ہمارے نیچے پگڈنڈی تھی جو آگے جا کر نیچے اُترتی تھی۔ ہم نیچے اُترنے لگے تو اچانک ایک تھانیدار سامنے آگیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس کے ساتھ پولیس کے دو سپاہی تھے۔ وہ گھاٹی چڑھ رہا تھا۔ وہ ہمارے علاقے کا تھانیدار نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارا علاقہ ہے کدھر....

"میں نے تھانیدار کو سلام کیا تو اُس نے گھوڑا روک لیا۔ اُس کی نظریں چاندبی بی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں تو اُس نے کہا کہ یہ لڑکی مسلمان نہیں لگتی۔ کیوں کاکی! تو مسلمان تو نہیں.... یہ گھبرا گئی اور میرے پیچھے ہو گئی۔ اُس نے اِس کے کپڑوں سے اور ڈیل ڈول سے پہچان لیا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟....

"تھانیداروں کے لیے تو ذرا سا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ گھوڑے سے اُتر آیا اور یہ رو پڑی۔ تھانیدار مسلمان تھا۔ اُس نے اِس کے سر پر ہاتھ

رکھ کر کہا — "مت ڈر کاکی! میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ یہ تجھے زبردستی کہیں لے جا رہا ہے؟" — اِس نے کہا — "نہیں۔ میں خود اِس کے ساتھ جا رہی ہوں" — تھانیدار نے اِس سے پھر پوچھا کہ ہندو ہو یا مسلمان تو اِس نے بتا دیا کہ ہندو ہوں اور مسلمان ہو جاؤں گی۔ تھانیدار نے اِس سے عمر پوچھی تو اِس نے سولہ سال بتائی....

"تھانیدار نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اُسے سارا معاملہ بالکل ٹھیک سنا دیا۔ ذرا سا بھی جھوٹ نہ بولا۔ تھانیدار نے مجھ پر غصہ نہ کیا نہ اُس نے کوئی گندہ لفظ بولا۔ بڑے آرام سے میری ساری بات سُن کر اُس نے کہا — "لڑکی نابالغ ہے بیٹا! تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ تھانے چلے چلو۔ تم آخر جاؤ گے کہاں؟ یہ اتنی خوبصورت اور معصوم لڑکی کسی ڈاکو یا بدمعاش نے دیکھ لی تو تو قتل ہو جائے گا اور یہ کسی شہر کے بازار میں بک جائے گی" — اُس نے پھر نہ میری کوئی عرض سُنی نہ اِس کے رونے کی پروا کی۔ اُس کے ساتھ ایک پولیس حوالدار تھا۔ اُسے کہا کہ تم واپس جاؤ۔ اِن دونوں کو تھانے لے جا کر چھوٹے تھانیدار (اے۔ ایس۔ آئی) کو کہو کہ اِن کے تھانے میں اِن کی اطلاع کر دے....

"تھانیدار آگے چلا گیا۔ وہ کسی گاؤں میں تفتیش کے لیے جا رہا تھا۔ حوالدار ہم دونوں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ میں نے راستے میں حوالدار سے کہا کہ وہ ہم سے پیسے لے لے اور چھوڑ دے۔ اس (لڑکی) نے جو زیور پہن رکھا تھا، یہ اُسے لے لینے کو کہا۔ اُس نے کہا کہ تم اگر یہ سالم لڑکی میرے حوالے کر دو تو بھی میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میں اکیلا ہوتا اور تمہیں پکڑتا تو شاید تمہاری بات مان جاتا۔ اب تو میں تھانیدار کے حکم کا باندھا ہوا ہوں۔ یہ بڑا سخت تھانیدار ہے۔ اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑتا۔ اگر اسے یہ پتہ چل جائے کہ میں نے اِس لڑکی کے جسم کو ذرا سا ہاتھ لگایا تھا تو یہ مجھے اندر کر دے گا....

"ہمیں تھانے لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ وہاں جو چھوٹا تھانیدار تھا، وہ بھی

مسلمان تھا۔ مجھے زیادہ خطرہ یہ نظر آتا تھا کہ پولیس والے اس لڑکی کو تنگ کریں گے لیکن تھانے میں ہمارے ساتھ کسی نے کوئی غلط حرکت نہیں کی بلکہ ہمیں کھانا کھلایا اور عزت سے بٹھایا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا کیا کارروائیاں کیں۔ شام کو بڑا تھانیدار آگیا۔ اس کے بعد ہندو ساہوکار (لڑکی کا باپ)، میرے گاؤں کا نمبردار، میرا باپ اور گاؤں کے دو اور آدمی آگئے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ میرے علاقے کے تھانے سے ایک حوالدار اور ایک سپاہی بھی آیا ہے....

"پہلے اسے (لڑکی کو) مجھ سے الگ کیا گیا۔ پھر مجھے ہتھکڑی لگائی گئی اور رات کو مجھے اپنے تھانے میں لے گئے۔ وہاں مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ چاند کو بھی رات تھانے میں گذارنی پڑی۔ صبح میرے بیان ہوئے، پھر تم سمجھ لو کہ پولیس اور کچہریوں کا چکر چل پڑا اور مجھے راولپنڈی جیل میں بھیج دیا گیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ میرے باپ نے معمولی سا وکیل کر لیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں وہ ساری باتیں کہیں جو چھ سال گزرے تمہیں سنائی تھیں میں نے یہ بھی کہا کہ چوروں کو اور مجھ جیسے لوگوں کو سزا دینے کے لیے قانون جاگ اٹھتا ہے لیکن یہ ہندو ساہوکار دیہاتیوں کو لوٹ رہے ہیں اور قانون کہاں سویا ہوا ہے....

"میری کون سنتا تھا۔ ہندو ساہوکار ایسے ایسے گواہ لایا تھا جو یہ ثابت کر رہے تھے کہ میں نے اس کافر کے گھر ڈاکہ ڈالا ہے اور اس کی لڑکی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس کی طرف سے نمبردار بھی پیش ہوا تھا۔ اس نے میرے خلاف ایک بھی بات نہ کی بلکہ اس نے کہا کہ میں نے ہندو ساہوکار کو تین چار بار کہا تھا کہ تمہاری بیٹی جوان ہے اور تم نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک جوان لڑکا بیگار میں رکھا ہوا ہے جو خوبصورت جوان ہے لیکن لالہ جی نے دھیان نہ دیا....

"ایک تو نمبردار کا بیان مجھے بچا گیا اور دوسرا بیان چاند کا تھا جس نے مجھے لمبی سزا سے بچا لیا۔ اس (چاند) نے کہا "میرا باپ ظالم اور بددیانت آدمی ہے۔ لوگوں کو سود پر قرضہ دے کر حساب کتاب میں گڑبڑ کرتا اور انہیں لوٹتا رہتا ہے۔ اس نے شانے کو بیگار میں رکھا ہوا تھا اور اس شانے کا کتا زبردستی مفت لے کر بیچ دیا تھا۔ اس نے میری بھی قیمت وصول کر لی تھی اور میرا بیاہ ایسے آدمی سے کر رہا تھا جو جسمانی اور دماغی لحاظ سے ناکارہ ہے۔ میں نے شانے کو مجبور کیا تھا کہ مجھے کہیں لے چلے میں اس گھر میں نہیں رہوں گی"....

"اس کا بیان بہت لمبا تھا۔ سرکاری وکیل نے اور میرے وکیل نے بھی اس پر بہت جرح کی تھی۔ یہ یہی کہتی رہی کہ اس کا باپ ظالم اور بے ایمان ہے اور یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور یہ گھر سے ایک پیسہ بھی نہیں لے گئی تھی۔ میرے خلاف یہ بات جاتی تھی کہ لڑکی عمر کے لحاظ سے نابالغ تھی۔ اس پر مجھے دو سال سزا ہو گئی....

"جیل میں مجھے اس وقت تحصیل چکوال کے دو آدمی مل گئے تھے جب میں جیل میں حوالاتی تھا اور ابھی مقدمہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میں تمہیں ان دونوں آدمیوں کے نام نہیں بتاؤں گا۔ صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ وہ چار چار سال قید کاٹ رہے تھے اور ان کی قید کا ایک ایک سال رہتا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ کہتے تھے کہ یہ قید ان کے کاروبار کا حصہ ہے.... تم سمجھ گئے ہو گے کہ ان کا کاروبار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور مجھے وہ راستہ دکھایا جس پر وہ چل رہے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمارے ساتھ دوستی نبھاؤ گے تو سب قرضے اور سود بیاج ختم ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ دوسروں کو چوسنے اور ان کا خون نچوڑنے والوں کا تم شرافت سے ہاتھ نہیں روک سکتے....

"مجھے ان کی باتیں اچھی لگیں۔ مجھے دو سال قید مل گئی تو انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہوا ہے۔ اب تم باہر نکلو گے تو قانون تمہارے ہاتھ میں ہو گا.... بات مختصر کرتا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنی شاگردی میں بٹھا لیا۔ میں تو جلا بھنا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ویسے نہیں تو

ایسے سہی۔ وہ ایک سال میرے ساتھ رہ کر چلے گئے اور مجھے اپنا ٹھکانہ بتا گئے۔ وہ مجھے زبانی اُستاد بنا گئے۔ وہ گئے تو میں نے اندر دو اور استاد پکڑ لئے۔ وہ رہزنی کے اُستاد تھے۔

"جیل میں میرا چال چلن ٹھیک رہا اور میں ہر روز کی مشقت بھی پوری کرتا رہا اس لیے دو سال میں مجھے تین مہینے معافی مل گئی۔ میں ایک سال اور نو مہینے پورے کر کے گاؤں میں آگیا۔ میرے باپ نے مجھے پہلی خبر یہ سنائی کہ ساہوکار اُسے بہت تنگ کرتا رہا ہے۔ نقد سُود الگ لیتا رہا کہ فصل آنے پر وہ پہلے سے زیادہ دانے اُٹھائے جاتا تھا۔ اصل رقم ابھی اُسی طرح باقی تھی بلکہ اُس نے ایسا حساب جوڑا تھا کہ اصل رقم کچھ زیادہ ہوگئی تھی....

"مجھے دوسری خبر یہ سنائی گئی کہ کانتی (چاند بی بی) کی زندگی برباد ہو گئی ہے۔ اس (لڑکی) کے ساتھ یہ بیتی کہ جس کے ساتھ اِس کی شادی ہوئی تھی، اُس کے ماں باپ نے یہ کہہ کر شادی ختم کر دی کہ لڑکی ایک مسلمان کے ساتھ نکل گئی تھی اور تین چار دن اور راتیں اُس کے ساتھ رہی ہے پھر یہ تھانے میں بھی رہی ہے....

"یہ اتنی بدنام ہوگئی کہ اِس کا رشتہ مانگنے کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ تم خود سیانے ہو۔ دُور دُور تک ہندوؤں میں مشہور ہوگیا کہ لالہ دیال چند کی بیٹی ایک مسلمان کے ساتھ چلی گئی تھی اور اُس نے عدالت میں اپنے باپ کے خلاف گواہی دی ہے.... اس لڑکی کو اپنی ماں نے اور اپنے باپ نے دھتکار دیا۔"

"میرے ماں باپ نے میرے برتن الگ کر دیئے تھے"۔۔۔ چاند بی بی بول پڑی۔۔۔ "ماں مجھے چولہے چوکے کے قریب نہیں جانے دیتی تھی۔ کہتی تھی کہ تم ناپاک ہو۔ ملیچھ ہو۔ تم نے اپنا دھرم بھرشٹ (ناپاک) کر لیا ہے۔ باپ نے میرے ساتھ بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ کہتا تھا کہ مجبوری ہے کہ تم نے اِس گھر میں جنم لیا ہے ورنہ میں تمہیں زندہ جلا دیتا.... اگر میرے باپ میں مسلمانوں والی

دلیری ہوتی تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔"

"میں نے جب اسے دیکھا تو میں نے دل سے کہا کہ یہ کانتی نہیں کوئی اور ہے"۔۔۔ علی شان نے کہا۔۔۔ "اس کا رنگ پیلا تھا، چہرے پر جوانی کی رونق تھی ہی نہیں۔ اِس کے کپڑے میلے اور معمولی سے تھے۔ یہ کسی غریب گھر کی لڑکی لگتی تھی۔ میں نے ایک عورت کی زبانی اسے پیغام بھیجا کہ تیار رہنا، اب ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اس نے جواب بھیجا کہ میں زندہ جل رہی ہوں۔ جب کہو گے جہاں کہو گے، چلوں گی۔ اپنے باپ کے سامنے گھر سے نکلوں گی....

"مجھے چکوال والے جیل کے دوستوں نے اپنا جو ٹھکانہ بتایا تھا، میں دوسرے دن وہاں چلا گیا۔ اُنہوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ میں اُن کے پاس دو روز رہا اور گاؤں میں آگیا۔ گاؤں میں میرا رویہ اس طرح ہوگیا تھا جیسے میں مر گیا ہوں۔ چار روز گذرے، آدھی رات کے وقت چاند کے باپ (ہندو ساہوکار) کا واویلا سنائی دیا۔ اس لڑکی کی ماں بھی چیخ رہی تھی۔ گاؤں کے آدمی جاگ اُٹھے اور دوڑتے پہنچے۔ میں بھی گیا۔ ساہوکار لُٹ گیا تھا۔ دو ڈاکو آئے تھے۔ انہوں نے ساہوکار اور اُس کی بیوی کو جگایا۔ اُن کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ انہوں نے ساہوکار کی لوہے کی تجوری اُسی سے کھلوائی اور زیور اور رقم نکال کر لے گئے....

"صبح پولیس آئی۔ سب سے پہلے مجھے مشتبہ بٹھایا گیا۔ میں نے تھانیدار سے کہا کہ مجھے مارو پیٹو گے تو بھی بے فائدہ ہو گا۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے دیکھا ہے کہ ساہوکار کا شور شرابہ سُن کر میں اپنے گھر سے نکلا تھا۔ تھانیدار نے پھر بھی میرے گھر کی تلاشی لی۔ کئی آدمیوں سے پوچھا اور تسلی کر کے مجھے چھوڑا۔ میرے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ ڈاکہ کس نے ڈالا ہے۔ مال بہت دُور پہنچ گیا تھا۔ تھانیدار تفتیش کرتا رہا پھر وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ ایک مہینہ گزر گیا تھا....

"ایک روز اِس (لڑکی) سے ملاقات ہوگئی۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت اور موقع نہیں تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ میرا باپ اتنا کچا نہیں کہ سارا مال گئے

(تجوری) میں ہی رکھ دے۔ اُس نے بہت سا مال چھوٹے سے ایک گھڑے میں رکھا ہُوا ہے۔ اِس نے یہ بھی بتایا کہ وہ گھڑا کہاں رکھا ہے۔ بڑا چالاک آدمی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کبھی ڈاکہ پڑا تو ڈاکو تجوری پر ہی ہاتھ ڈالیں گے۔ اگر تجوری میں کچھ نہ ہُوا وہ کہیں گے کہ مال نکالو۔ پھر سارا مال ہاتھ سے جائے گا، اِس لیے اُس نے تھوڑا سا مال تجوری میں رکھا ہُوا تھا....

"میں نے دیکھ لیا تھا کہ پولیس ہار گئی ہے۔ ایک دو روز بعد ساہوکار مجھے باہر مل گیا۔ میں نے اُسے کہا "لالہ جی مہاراج! ابھی گھر چلو اور بہی کھاتے میں میرے باپ کے قرضے پر لکیر پھیر دو۔ لکھ دو کہ قرضہ ادا ہوگیا ہے اور میرے باپ سے تم نے جو سٹام لکھوایا تھا، وہ مجھے دے دو اور یہ بھی سُن لو۔ میں گاؤں میں رہوں گا۔ تھانے جا کر تھانیدار کو بتانا کہ میں نے تمہیں ایسے کہا ہے پھر دیکھنا تیرا گھر کس طرح اُجڑتا ہے'....

"اُس نے رُعب جمانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا "لالہ! اُس گھڑے کو کہاں چھپاؤ گے۔ گھڑے کے ساتھ تم بھی اور تمہاری بیوی بھی اور تمہاری بیٹی بھی غائب ہو جائے گی۔ ہوش میں آؤ۔ کیا پولیس نے تمہیں چور پکڑ دیئے ہیں؟ وہ ساری عمر چوروں کو نہیں پکڑ سکتے '....

"ساہوکار سخت گھبرایا۔ وہ پہلے ہی ڈرا ہُوا تھا۔ مجھے گھر لے گیا۔ بہی کھاتے میں اُس نے میرے باپ کے قرضے کی وصولی لکھ دی اور سٹام مجھے واپس کر دیا، پھر اُس نے میرے آگے ہاتھ [illegible]ے اور رو پڑا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے تو اُس کے گھر کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے خلاف کوئی بات نہیں کرے گا....

"میں نے سٹام اپنے باپ کو دکھا کر جلا ڈالا۔ اُسے اور میری ماں کو اتنی خوشی ہُوئی کہ دونوں کے آنسو نکل آئے۔ میں نے دو روز انتظار کیا۔ تیسری رات یہ (لڑکی) گھر سے نکلی۔ میں پہلے ہی گاؤں سے نکل گیا تھا۔ یہ آئی تو میں اس کے ساتھ چل پڑا اور رات ہی رات ایک ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ دن وہاں گذارا۔ وہاں سے گھوڑی مل گئی۔ اِسے گھوڑی پر بٹھایا اور صبح تک میں اپنے

جیل والے دوستوں کے پاس پہنچ گیا....

"اِسے کلمے پڑھائے، اس کا نام چاند بی بی رکھا اور اس کے ساتھ نکاح پڑھایا۔ چار سال گزر گئے ہیں۔ اپنی بادشاہی ہے۔ کوئی غم نہیں، کوئی فکر نہیں کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دوستوں نے ٹھیک کہا تھا کہ ویسے نہیں تو ایسے سہی۔"

علی شان نے مجھے اپنا ٹھکانہ نہ بتایا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ وہ اور چاند بی بی بہت خوش تھے۔ اس کے بعد آج تک علی شان مجھے نظر نہیں آیا۔

پہنچ والی فقیرنی

لوگ پیروں کی مریدی کرتے ہیں، مزاروں، خانقاہوں اور زیارتوں پر جا کر سجدے کرتے ہیں۔ مقبروں میں کوئی بھی دفن ہو، اُس کی قبر پر ماتھے رگڑتے، قبر کی مٹی کھاتے اور اپنے پیٹ میں کیڑے پیدا کرتے ہیں۔ میں دیہاتی ہوتے ہوئے بھی پیری مریدی اور قبر پرستی کا قائل نہیں۔ میری عقیدت اپنے گاؤں کے قبرستان سے ہے جہاں میرے اپنے اور میرے گاؤں کے بزرگ دفن ہیں۔ وہاں میرے لڑکپن کے وہ دوست دفن ہیں جن کی میں آپ کو کہانیاں سناتا رہتا ہوں۔ اس قبرستان میں میری بڑی پیاری یادیں دفن ہیں۔ ستمبر ۱۹٦۵ء میں میرے گاؤں کے چھ شہیدوں نے اس قبرستان کو مقدس بنا دیا ہے۔ ان چھ قبروں کے سامنے مجھے مرے ہوئے پیروں کے مزار اور مقبرے ایسے لگتے ہیں جیسے گلاب کے پودوں کے مقابلے میں کیکر کے خار دار درخت۔

میں ستمبر کے مہینے میں جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے گاؤں ضرور جاتا ہوں اور ان چھ قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہوں اور اُن کچی قبروں کو دُھلی ہوئی چادر سے صاف کرتا ہوں۔ میرا سینہ جو بُڑھاپے سے سُکڑ آیا ہے، ان قبروں کو دیکھ کر فخر سے پھیل جاتا ہے۔ میں جوان ہو جاتا ہوں۔

ہر ستمبر میں ارادہ کرتا ہوں کہ آپ کو ایک کہانی سناؤں گا لیکن ہر بار ارادہ ٹوٹ جاتا رہا۔ اب وہ کہانی سناتا ہوں۔ پانچ مہینے گذرے وہ پاگل ماں مرگئی ہے جس کی یہ کہانی ہے۔ وہ "یا علیؓ" کے نعرے لگاتی دنیا سے اُٹھ گئی ہے۔

میرے ساتھ آدھی صدی پیچھے چلیں جب میں نوجوان ہوا کرتا تھا ہمارے گاؤں کا ایک نوجوان تھا۔ نام خوشحال تھا اور خوشا کہلاتا تھا۔ امیر باپ کا بیٹا تھا۔ باپ

صوبیدار میجری پنشن آیا تھا۔ ہمارے علاقے کی زمینیں بارانی ہیں، یعنی ہماری کاشت کاری بارشوں کے رحم وکرم پر ہے۔ خوشے کے باپ کو انگریزوں نے نہری علاقے میں دو مربع اراضی عطا کی تھی۔ اپنے گاؤں کے اردگرد بھی اُس کی بہت زمین تھی۔

خوشا ہماری شکاری پارٹی میں شامل نہیں تھا۔ وہ کبڈی، گھوڑسواری اور نیزہ بازی کا شوقین تھا۔ بڑا خوبصورت جوان نکلا تھا۔ ایک بار وہ اپنے نہری مربعوں پر گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک ایسی نسل کا کُتا تھا جو نسل ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ غالباً بُوہلی اور ٹیرئیر کی ملی جُلی (کراس بریڈ) نسل تھی۔ خوشے کو یہ کُتا اُس کے باپ کے ایک دوست نے جو نہری علاقے کا رہنے والا تھا، تحفہ دیا تھا۔ یہ بڑا قیمتی تحفہ تھا۔ خوشے نے ہمیں کہا کہ وہ کسی روز ہمارے ساتھ شکار پر جائے گا۔ ہم نے اُسے کہا کہ وہ صرف اس لیے شکار پر جانا چاہتا ہے کہ اُس کے پاس ایک کُتا آ گیا ہے لیکن شکار کبڈی اور گھوڑسواری نہیں۔ کُتوں کے ساتھ کُتوں کی طرح دوڑنا پڑتا ہے۔

وہ زمانہ زنگا رنگ لباس کا نہیں، جسم کے پٹھوں کا زمانہ تھا۔ اُس جوان کو ہر کوئی پسند کرتا تھا جس کے پٹھے (مَسل) بنے ہوئے ہوں۔ آج کل رضائیوں کے کپڑوں جیسے بڑے بڑے پھولوں والے کپڑوں کی بُش شرٹیں اور قمیضیں پہن کر نوجوان اُلو کے پٹھے بن جاتے ہیں۔ ہماری جوانی میں جسم کے پٹھے ورزش، محنت اور بھاگ دوڑ سے بنائے جاتے تھے اور انہی پٹھوں کی قدر تھی۔ اس لحاظ سے خوشا دلکش جوان تھا۔ کہتا تھا کہ اُسے ایک بار ساتھ لے چلیں تو سب کو پتہ چلے گا کہ وہ کُتوں کے ساتھ کُتوں کی طرح دوڑ سکتا ہے یا نہیں۔

دو تین دنوں بعد ہم نے صرف اُس کی خاطر شکار کا پروگرام بنا لیا۔ پو پھٹنے سے پہلے ہم سب گاؤں سے نکل گئے۔ صبح کی سفیدی ظاہر ہونے لگی تو ہم گاؤں سے تقریباً تین میل دُور چلے گئے تھے۔ اگر علاقہ میدانی ہوتا تو ہم بہت دُور جا چکے تھے۔ کھڈ نالوں اور گھاٹیوں نے ہمیں تیز نہ چلنے دیا۔ کُتے زنجیروں میں تھے اور زنجیریں مالکوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ جب تک صبح صاف نہیں ہوئی تھی ہم کُتوں میں بے چینی دیکھتے رہے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ ایک اجنبی کُتے کی

موجودگی محسوس کر رہے ہیں۔ روشنی ہوتے ہی کُتوں نے اجنبی کُتے کو دیکھ لیا۔ یہ خوشے کا کُتا تھا۔ اگر وہ معمولی سا کُتا ہوتا تو ہمارے کُتے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے لیکن خوشے کا کُتا کُتوں کی دنیا کا شہزادہ لگتا تھا۔ خوشے نے اُسے ایک روز پہلے نہلایا تھا اور وہ خوبصورت بھی تھا۔ سب سے پہلے ہمارے کُتوں کی ٹیم کے لیڈر، ہمارے دوست افضل کے بُوہلی نے خوشے کے کُتے کی طرف جانے کی کوشش کی۔ یہ ہمارا سب سے زیادہ خونخوار کُتا تھا۔ اپنی طاقت اور خونخواری کے زور پر ٹیم کی لیڈری کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہُوا تھا۔ جب کبھی ٹیم میں کوئی نیا کُتا آتا تھا تو بُوہلی پہلی جھڑپ میں ہی اُسے ذہن نشین کرا دیتا تھا کہ یہاں اُس کی حکومت ہے اور وہ لیڈری کا خیال دل سے نکال دے۔

مثل مشہور ہے کہ کُتا کُتے کا وَیری ہوتا ہے لیکن کُتے کی نفسیات دراصل یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کُتوں پر اپنی لیڈری یا برتری مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس روز خوشے کے کُتے کو دیکھ کر جب بُوہلی غُرّا کر اُس کی طرف بڑھا تو افضل نے اُس کی زنجیر کھینچ لی۔ دوسرے کُتوں نے اپنے لیڈر کو غرّاتے اور حاکمانہ ”بُف“ کرتے دیکھا تو سب کُتوں نے خوشے کے کُتے کی طرف دیکھا اور غرّانے لگے۔

ہم اس صورتِ حال کے لیے تیار تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یوں ہوگا۔ کُتے جمہوریت پسند نہیں ہوتے۔ یہ لیڈری اور اقتدار کا معاملہ تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کُتوں کو جب شکار کے پیچھے چھوڑیں تو وہ آپس میں اقتدار کی جنگ شروع کر دیں۔ شکار سے پہلے فیصلہ ضروری تھا۔ ہم نے اس خیال سے کہ تمام کُتے خوشے کے کُتے سے مانوس ہو جائیں، کُتوں کے پٹوں سے زنجیریں الگ کر دیں۔ خوشے کو ہم نے بتا دیا تھا کہ اُس کے کُتے کی اور بُوہلی کی لڑائی ہوگی اور وہ نہ گھبرائے۔ ہم اُن کی دوستی کرا دیں گے۔

زنجیریں الگ ہوتے ہی بُوہلی خوشے کے کُتے تک پہنچا اور سب سے پہلے اُسے پیچھے سے سُونگھا۔ خوشے کا کُتا گھوما اور منہ بُوہلی کے منہ کے قریب کر کے غُرّایا — ”دیکھو بھائی! میرا تیرا آپس میں مذاق نہیں۔ یہ بیہودہ حرکت پھر نہ کرنا“

بُوبلی سمجھ گیا کہ کُتّا غیرت والا ہے لیکن بُوبلی نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ یہ نوجوان اور خوبصورت کُتّا اُس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ بُوبلی غصّے سے اور بلند آواز سے غرّایا ــــ "اوئے میں جسے چاہوں اور جدھر سے چاہوں سُونگھ سکتا ہوں، مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس بڑک کے جواب میں خوشے کے کُتّے نے بُوبلی سے زیادہ اُونچی آواز میں بڑک ماری ــــ "اِن کُتّوں میں تمہاری جو عزّت بنی ہوئی ہے وہ ایک منٹ میں برباد کر دوں گا۔"

دوسرے کُتّے بُوبلی کے اشارے کے منتظر تھے۔ وہ بُوبلی کے خوشامدی اور حاشیہ بردار تھے۔ وہ سب خوشے کے کُتّے پر غرّا رہے تھے۔ خوشے کے کُتّے کی نظریں بُوبلی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دوسرے کُتّوں کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ غالباً جانتا تھا کہ اِن خوشامدیوں کا کیا ہے، لیڈری میرے ہاتھ میں آگئی تو یہ میرے اشاروں پر ناچا کریں گے۔

ہمیں یہ یقین تھا کہ بُوبلی خوشے کے کُتّے کا بُرا حال کر دے گا۔ نقصِ امن کے خطرے کے پیشِ نظر ہم درمیان میں آگئے۔ ہم کُتّوں کی دوستی کرانے کے طریقے جان گئے تھے۔ خوشے کو ابھی ان طریقوں سے واقفیت نہیں تھی ہمارے ایک دوست نے خوشے کے کُتّے کے پاس بیٹھ کر بازو اُس کے گرد لپیٹ دیا۔ افضل نے اپنے بُوبلی کو اسی طرح پکڑ لیا۔ دونوں نے کُتّوں کے ساتھ پیار کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے قریب کر کے اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرے اور دونوں کی دوستی کرا دی۔ بُوبلی کو صرف اس یقین کی ضرورت تھی کہ اُس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔ افضل کی تھپکیوں نے اُسے یقین دلا دیا۔ کُتّوں کے سیاسی نظریات اور عقیدے کچھ اور ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاں عوام طاقت کا سرچشمہ نہیں ہوتے بلکہ عوام ایسا سرچشمہ ہوتے ہیں جس پر کوئی نہ کوئی اپنی طاقت سے قبضہ کیے رکھتا ہے۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ شکار نظر آیا تو بُوبلی اور ہمارے دوسرے کُتّے خوشے کے کُتّے کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ ہم اُس روز ذرا دُور جانے کے ارادے

سے شکار کو نکلے تھے۔ پتہ چلا تھا کہ ایک علاقے میں بھیڑیوں کا جوڑا آگیا ہے۔ اس جوڑے نے ابھی کسی انسان یا مویشی پر حملہ نہیں کیا تھا۔ کئی لوگوں نے اس جوڑے کو اکٹھے پھرتے دیکھا تھا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں سنایا ہے کہ اُس زمانے میں آبادیاں کم اور ویرانے زیادہ ہوتے تھے۔ ہمارے علاقے میں اکّا دُکّا بھیڑیا کبھی کبھار نظر آجاتا تھا۔ ہمارے گاؤں سے سولہ سترہ میل دُور سے وہ کوہستانی علاقہ شروع ہوتا ہے جو راولپنڈی اور جہلم کے درمیان واقع ہے۔ اس میں بھیڑیئے خاصے ہوتے تھے۔ یہ تمام علاقہ غیر آباد جنگل ہُوا کرتا تھا۔ شاید وہاں کے بھیڑیوں کا کوئی جوڑا ہمارے علاقے میں آجاتا ہوگا۔

اب ہمارے علاقے کے ویرانے بھی آباد ہو گئے ہیں۔ گیدڑوں اور بھیڑیوں کی کمی انسانوں نے پوری کر دی ہے۔ اب میں اپنے علاقے کی بہت سی جگہیں پہچان ہی نہیں سکتا۔ اپنی اولاد کو بتاتا ہوں کہ یہاں وسیع کھڈ یا گہرا نشیب ہُوا کرتا تھا تو میرے بچّے نہیں مانتے کیونکہ اب وہاں میدان ہے۔ آدھی صدی کی بارشوں نے میرے علاقے کے خدوخال بدل ڈالے ہیں۔

میں بھیڑیوں کے ایک جوڑے کی بات سُنا رہا تھا۔ اس جوڑے نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن انہیں ہم مارنا چاہتے تھے کیونکہ یہ بھیڑیئے تھے۔ وہ جس جگہ تھے وہ دس بارہ میل دُور تھی لیکن یہ دس بارہ میل میدانی نہیں تھے۔ راستے میں تین کسّیاں (برساتی ندیاں) آتی تھیں۔ گہرے نالے کئی تھے۔ نشیب بھی تھے اور گھاٹیاں بھی۔ ہم پگڈنڈیوں سے ہٹ کر کھڈ نالوں میں سے گذرتے جا رہے تھے۔ کُتّوں کو ہم نے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ ہماری نظر افضل کے بُوبلی اور خوشے کے کُتّے پر تھی۔ ان میں اگر دوستی نہیں ہوئی تھی تو انہوں نے آپس میں سفارتی قسم کے تعلقات ضرور قائم کر لیے تھے۔ صرف ایک موقع ایسا آیا کہ بُوبلی کو خوشے کے کُتّے پر غصّہ آیا۔ خوشے کا کتّا ایک گلہری کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔ بُوبلی نے دوڑ کر اُس کے پہلو سے اپنا پہلو ٹکرایا۔ گلہری درخت پر چڑھ گئی۔

بُوبلی خوشے کے کتّے کے منہ سے منہ لگا کر غرّایا ــــ "میری اجازت

کے بغیر کوئی کُتا کسی جانور کے پیچھے نہیں دوڑ سکتا اور کوئی کُتا میرے بھونکنے سے پہلے نہیں بھونک سکتا۔"

خوشے کا کُتا سمجھ گیا۔ وہ اچھی ذات کا کُتا تھا۔ ہم نے بعد میں دیکھا کہ وہ بات جلدی سمجھتا تھا۔ لڑنے میں اور شکار کو پکڑنے میں قابلِ تعریف تھا۔ وہ صرف اس لیے نہیں لڑتا تھا کہ وہ کُتا تھا۔ وہ مالک کے اشارے پر لڑتا تھا۔ میں اُسے باوقار کُتا کہا کرتا تھا۔

ہم اُس علاقے میں پہنچ گئے جہاں ہم نے سنا تھا کہ بھیڑیوں کا جوڑا رہتا ہے۔ وہ ویرانہ تھا۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ کہیں سے گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ وہاں ایک دوسرے سے ملے ہوئے مٹی کے ٹیلے بھی تھے۔ کہیں سے زمین اُوپر کو اُبھری ہوئی تھی۔ اس میں کہیں کہیں لمبوترے دہانوں والے بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان میں سے بارشوں کا پانی اندر جاتا اور زیرِ زمین جاکر زمین کو اور زیادہ کٹا پھٹا بناتا تھا۔

ہم اُس قسم کے شکاری نہیں تھے جن کی کہانیوں کے ترجمے آپ اُردو کے رسالوں میں پڑھا کرتے ہیں۔ یہ شکاری جانوروں اور درندوں کے پنجوں کے نشان پہچان لیتے ہیں اور کھوجیوں کی طرح اپنے شکار کی کچھار تک یا جہاں کہیں وہ پانی پیتا ہے وہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارا شکار تو لہو گرم رکھنے کا بہانہ تھا۔ ہمیں شکار کے اصول اور طور طریقے آتے ہی نہیں تھے۔

ہم نے کُتوں کو کُھلا چھوڑ دیا۔ ہمارے دو کُتے بُوگیر تھے۔ بُو اور مُشک تو ہر کُتا پا لیتا ہے، ہر کُتے کی سونگھنے کی حِس حیران کُن حد تک تیز ہوتی ہے لیکن بُوگیر کُتوں کی نسل کی سُونگھنے کی حِس عام کُتوں سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ہمارے پاس جو دو بُوگیر کُتے تھے وہ بے تابی سے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ وہاں خرگوش، سیہہ، گوہ، گیدڑ اور شاید بھیڑیوں کی بُو کی کمی نہیں تھی۔ یہ سب ایسے ہی علاقوں میں رہتے تھے جہاں اُنہیں قدرت کے بنائے ہوئے زمین دوز ٹھکانے مِل جاتے تھے۔

کوئی دو سو گز دُور ہمیں ایک خرگوش نظر آیا۔ ہم نے ایک کُتے کو جو ہمارے

قریب تھا، پکڑ کر وہ خرگوش دکھایا۔ کُتا "بُف" کہہ کر دوڑ پڑا۔ اُسے دیکھ کر تمام کُتے اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ خرگوش نے ابھی اِدھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پُھدکتا وہیں کہیں نیچے اُتر گیا۔ کُتوں کے پیچھے ہم سب لڑکے دوڑے جا رہے تھے۔ کُتے بہت تیز تھے۔ اُس جگہ ہم سب سے پہلے پہنچ گئے جہاں خرگوش تھا۔ کُتے غائب ہو گئے۔

ہم وہاں پہنچے تو دیکھا زمین ڈھلانی ہو کر نیچے چلی گئی تھی۔ ہمارے سامنے ایک نشیبی میدان تھا۔ کچھ آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلے اُبھرے ہوئے تھے۔ کُتے دوڑے جا رہے تھے۔ ہمیں خرگوش کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹیلوں کی [illegible] سے خرگوش نکلا۔ وہ اس طرح بھاگ رہا تھا کہ دوڑتا بھی تھا اور اُڑتا بھی تھا۔ وہ کُتوں کا راستہ کاٹ گیا۔ اس کے پیچھے دو بھیڑیئے تیز دوڑتے اوٹ سے نکلے۔ خرگوش کُتوں سے بچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ آگے سے اُسے بھیڑیئے مل گئے۔

بھیڑیوں نے شاید کُتوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ خرگوش میں مگن تھے۔ ہم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ کُتوں نے اپنا رُخ بدل لیا۔ اب وہ اُن بھیڑیوں کے پیچھے جا رہے تھے جو خرگوش کے پیچھے جا رہے تھے۔ خرگوش کے آگے ایسی ڈھلان آ گئی جس کا زاویہ خاصا زیادہ تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے ہوا میں اُٹھا اور ڈھلان پر جا پڑا مگر اُس کے پاؤں جم نہ سکے۔ اُس نے اُوپر جانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا تھک گیا تھا کہ اُوپر نہ چڑھ سکا۔ دونوں میں سے ایک بھیڑیئے نے اپنے پیچھے کُتوں کو دیکھ لیا۔ وہ وہیں سے مُڑا اور رفتار دُگنی کر کے ایک طرف نکل گیا۔

دوسرا بھیڑیا ڈھلان پر چلا گیا۔ خرگوش اُس کے نیچے سے لڑھک آیا۔ بھیڑیئے نے اب بھی کُتوں کی پروا نہ کی۔ کُتے چند قدم دُور رہ گئے تھے۔ بھیڑیئے نے بڑی پُھرتی سے گھوم کر اور نیچے آ کر خرگوش کو پکڑ لیا۔ اُسے وہ بھنبھوڑ ہی رہا تھا کہ کُتے اُس پر ٹوٹ پڑے۔ دس گیارہ کُتوں میں آیا ہُوا بھیڑیا کر ہی کیا سکتا تھا لیکن ہم نے دیکھا کہ اُس نے لڑ جھگڑ کر کُتوں میں سے راستہ بنا لیا اور گھیرے سے نکل آیا۔

بھیڑیا بھاگا اور خوشے کے کُتّے نے اُس کا تعاقب کیا۔ اُس کے پیچھے فضل کا[illegible] اور [illegible]اکُتّا دوڑے۔ کُتّے اُس تک پہنچے تو وہ رُک گیا اور مقابلے پر ڈٹ گیا۔ دوسرے کُتّے خرگوش کے حصّے بخرے کر رہے تھے۔ خوشے کے کُتّے نے بھیڑیئے کی گردن اُوپر سے پکڑ لی اور اسے بھنبھوڑنے لگا۔ لُوبلی اور میرے کتے نے بھی بھیڑیئے کو جہاں منہ پڑا پکڑ لیا اور ذرا سی دیر میں بھیڑیا بے بس ہو گیا۔ ہم جب وہاں پہنچے، بھیڑیا مر چکا تھا۔ اِدھر خرگوش کی بوٹیاں اُڑ رہی تھیں۔

ہمارا نشہ پورا ہو چکا تھا۔ بھوک تیز ہو گئی۔ ہمارے ایک دوست نے جو اِس علاقے سے واقف تھا، کہا کہ ذرا آگے ایک کَس (برساتی نالہ) ہے۔ اس کے کنارے درخت بھی ہیں، وہاں چل کر کھانا کھائیں گے۔ ہم نے کُتّوں کو زنجیریں ڈالیں اور اُدھر چل پڑے۔ کَس نیچے تھا۔ گھاٹی سے اُتر کر ہم نیچے گئے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ان برساتی نالوں میں جنہیں ہم کَس کہتے ہیں، ساون کی بارشوں میں سیلاب آتا تھا اور چند گھنٹوں بعد گذر جاتا تھا۔ بعض کَس ایسے تھے جن میں نہ صرف اکتوبر کے مہینے میں بلکہ سردیوں میں بھی تھوڑا بہت پانی بہتا رہتا تھا جو گہرا نہیں ہوتا تھا۔ اگر پاٹ پتھریلا ہو تو پانی شفاف ہوتا اور پتھروں سے گذرتا بڑا اچھا لگتا تھا۔ یہ کَس ایسا ہی تھا۔

ہم گھاٹی کے تنگ راستے سے اُتر کر کَس کے کنارے پہنچے ہی تھے کہ ایک طرف سے چیخیں اور واویلا سنائی دیا۔ یہ آوازیں بچوں جیسی لگتی تھیں۔ کنارے کے ساتھ ایک ٹیلہ کھڑا تھا۔ اس کی اوٹ سے ایک بچّی جس کی عمر دس گیارہ سال تھی اور ایک بچّہ جو اُس سے ڈیڑھ دو سال چھوٹا تھا، دوڑتے ہوئے سامنے آئے۔ بچّی نے روتے ہوئے بتایا کہ اُس کی بڑی بہن ڈوب گئی ہے۔

ہم نے اور کچھ نہ سنا نہ کچھ پوچھا۔ ہم دوڑے گئے۔ ٹیلے کی دوسری طرف گئے تو ہمیں پتہ چل گیا کہ اس بچّی کی بہن کہاں ڈوبی ہے۔ یہ بتانے سے پہلے کہ ہم نے کیا کیا، میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جس کَس میں اتنا ہی پانی تھا کہ پاؤں صرف ٹخنوں تک ڈوبتے تھے وہاں اتنا گہرا پانی کہاں سے آ گیا تھا کہ کوئی اس میں ڈوب جاتا۔ ہمارے علاقے کے کَس بالکل سانپ کی طرح ہوتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے

پر مُڑ جاتے ہیں۔ اگر آپ کہیں جا رہے ہوں تو ایک ہی کَس تین چار بار آپ کے راستے میں آئے گا۔

بعض موڑ نوّے درجے کے ہوتے ہیں۔ ایسے بعض موڑوں پر پاٹ میں چٹانیں ہوتی ہیں۔ پانی ان سے ٹکراتا اور ایک طرف مُڑ جاتا ہے لیکن پانی شرافت سے نہیں مُڑتا۔ ایک کام یہ کرتا ہے کہ نیچے سے پاٹ کو کھودتا رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ جس چٹان سے ٹکراتا رہتا ہے اُسے کھاتا رہتا ہے۔ ساون کی طغیانی یہ دونوں عمل شدّت سے کرتی ہے اور نہ جانے کتنی صدیوں سے کرتی چلی آ رہی ہے۔ وہاں اس نے پاٹ کو اتنا زیادہ کھا لیا ہے کہ پانی گہرا ہو گیا ہے۔ اسے چھوٹا سا تالاب سمجھ لیں۔ اسے ہم اپنی زبان میں "ڈھن" کہتے ہیں۔ اس کا تلفّظ اس طرح صحیح ہوتا ہے کہ "ڈ" میں تھوڑی سی ملاوٹ "ٹ" کی کر لیں۔ آپ کی سہولت کے لیے میں اسے تالاب کہوں گا جس میں ایک طرف سے پانی آتا ہے اور دوسری طرف مُڑتا رہتا ہے۔

ایسا تالاب جو پانی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر بناتا رہے اس میں ایک بھیانک خطرہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ پانی چٹان کو کھاتے کھاتے چٹان میں بڑی چوڑی غار سی بنا دیتا ہے۔ یہ غار یا گُف زیرِ آب ہوتی ہے۔ اس خطرے سے جو واقف نہیں ہوتے وہ ڈبکی لگا کر تیرتے ہیں اور اس غار کے اندر جا پہنچتے ہیں۔ وہ جب پانی سے اُبھرتے ہیں تو سر غار کی چھت کے ساتھ اتنی زور سے لگتا ہے کہ چکّر آ جاتا ہے۔ اگر وہ قسمت والا ہو تو یہ محض اتفاق ہوتا ہے کہ باہر آ جاتا ہے ورنہ اندر ہی مر جاتا ہے اور اُس کی لاش بہت دنوں بعد باہر آتی ہے۔

ہمیں جب بچّی نے بتایا کہ اُس کی بہن ڈوب گئی ہے تو میں نے صرف تالاب کو دیکھا جو موڑ پر بن گیا تھا۔ وہاں سے ایک چٹان پانی کا راستہ نوّے درجے پر موڑتی تھی۔ ابھی ہم نے کچھ کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا کہ خوشا کپڑوں سمیت پانی میں کُود گیا۔ وہ پانی سے اُبھرا اور بلند آواز سے اُس نے کہا "کوئی اور پانی میں نہ آئے" ——— اور اُس نے پھر ڈبکی لگا دی۔ اب کے وہ زیادہ دیر پانی میں

رہا۔ وہ کبڈی کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اُس زمانے میں کبڈی سانس روک کر کھیلی جاتی تھی۔ کبڈی کے کھلاڑیوں میں سانس روکنے کی طاقت خاصی زیادہ ہوتی تھی۔ خوشا بڑا تنومند جوان تھا اور کبڈی کا کھلاڑی بھی۔ وہ ہم سے کہیں زیادہ دیر تک سانس روک سکتا تھا۔

وہ جب ڈُبکی سے نہ اُبھرا تو ہم پریشان ہونے لگے۔ آخر وہ اُبھر آیا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس نے کسی کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ تیر کر کم گہرے پانی میں آگیا جہاں وہ چل سکتا تھا۔ اُس نے کندھے پر ایک جوان لڑکی کو ڈال رکھا تھا۔ اُسے خوشے نے کنارے پر پیٹ کے بل لٹا دیا۔ اُسے، مجھے اور میرے تین چار دوستوں کو معلوم تھا کہ کیا کرنا ہے۔ لڑکی بے ہوش تھی۔ خوشے نے اُس کے منہ میں اپنی شہادت کی اور درمیانی اُنگلی ڈال دی اور اُنگلیاں اُس کے حلق تک لے گیا۔ میں نے لڑکی کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اُس پہ وزن ڈالا۔ لڑکی کو اُبکائی آئی اور اُس کے منہ سے بے شمار پانی نکلا۔ اس کے پہلو دبائے۔ کچھ اور پانی نکلا۔ پھر میں اُکڑوں بیٹھ گیا۔ میرے کہنے پر میرے ساتھیوں نے لڑکی کو اُٹھا کر اُس کا پیٹ میرے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اس طرح اُس کا پیٹ پُورا دب گیا اور اُس کے منہ سے خاصا پانی نکلا۔ زیادہ خطرہ یہ تھا کہ اُس کے پھیپھڑوں میں بھی پانی چلا گیا ہوگا۔ ہم نے اُوپر، نیچے اور دائیں بائیں سے دبا دبا کر اُس کی ناک میں سے بھی پانی نکالا۔

ہمارے کسی دوست نے بچّی اور بچے کو دوڑا دیا تھا کہ وہ اپنے گھر جائیں اور گھر والوں سے کہیں کہ ایک چارپائی لیتے آئیں۔ لڑکی کپڑوں سمیت پانی میں اُتر گئی تھی۔ اُس نے جب کراہنا شروع کیا تو ہمیں اُمید بندھی کہ یہ زندہ رہے گی۔

گاؤں کہیں قریب ہی تھا۔ کئی آدمی دوڑتے پہنچ گئے۔ چارپائی بھی آگئی۔ لڑکی کی ماں بھی ہاتھ ملتی آگئی۔ وہ تو اپنی بیٹی پر گر پڑی۔ ان آدمیوں میں چار اس لڑکی کے بھائی تھے۔ باپ، چچا اور ایک تایا بھی تھا۔ گاؤں کے آدمی بھی تھے۔ انہیں بچّی بتا چکی تھی کہ زینو "ڈھن" میں کُود دی تھی۔ پھر ہم بچّی کی چیخ و پکار پر آگئے اور خوشا پانی میں کُود گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بچّی زینو کی خالہ زاد بہن تھی۔

لڑکی کو جب چارپائی پر ڈالنے لگے تو اُس کے منہ سے نکلی — "بے جی! ہائے بے جی!" — وہ ماں کو پکار رہی تھی۔ اُس کے بھائی، باپ، چچا اور تایا لباس اور باتوں کے انداز سے اُونچی ذات کے کھاتے پیتے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے اُنہیں کہا کہ لڑکی کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ ہسپتال بہت دُور تھا۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ گاؤں میں سیانا موجود ہے، وہ اسے سنبھال لے گا۔ ایک بوڑھے نے لڑکی کو دیکھ کر کہا کہ اللہ نے اسے بچا لیا ہے۔ اس کے منہ میں گھی ڈالیں گے تو قے کر دے گی۔ سارا پانی باہر آجائے گا۔

وہ چل پڑے تو ہم وہیں کھڑے رہے۔ زینو کے باپ نے گھوم کے دیکھا اور وہیں سے بولا — "اوئے لڑکو! وہاں کیوں کھڑے ہو۔ اِدھر آؤ ہمارے ساتھ۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو زینو کا باپ اور اُس کا چچا اور تایا ہمارے پاس آگئے۔

"تم نے میری بیٹی کی جان بچائی ہے" — باپ نے کہا — "کیا میں تمہیں یہیں سے چلا جانے دوں گا؟ میرے ساتھ چلو۔ میری بے عزّتی نہ کرا دینا۔"

یہ اُس وقت کا دیہاتی معاشرہ تھا۔ زینو کے باپ کے ساتھ نہ جانے میں واقعی اُس کی بے عزّتی تھی۔ ہم اُن کے ساتھ چل پڑے۔ اُن کا گاؤں کس کے پار کوئی ڈیڑھ فرلانگ دُور تھا۔ راستے میں زینو کے باپ نے ہمیں بتایا کہ زینو چار بھائیوں کی ایک ہی بہن ہے۔ ماں کو اس سے ویسا ہی پیار ہے جیسا اکلوتے بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ لڑکوں کی طرح کدکڑے لگاتی پھرتی ہے۔

"آج اِدھر آنکلی" — باپ نے کہا — "اور کپڑوں سمیت ڈھن میں کُود گئی۔ مجھے اس بچی اور بچے نے بتایا ہے جو اس کے ساتھ تھے۔"

زینو کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور اُس کی خوبصورتی میں کوئی شک نہیں تھا۔ اُس کا جسم پھرتیلا تھا۔

ہم اُن کے گاؤں میں پہنچے تو گاؤں کی ساری آبادی باہر آگئی۔ اُن لوگوں کا

مکان پکا یعنی اینٹوں کا تھا۔ یہ اُن کی امارت اور اُونچی ذات کا ثبوت تھا۔ لڑکی کو اندر لے گئے اور ہمیں بیٹھک میں بٹھایا گیا۔ ہماری جو خاطر تواضع کی گئی وہ ہماری اپنی ماؤں نے بھی کبھی نہ کی تھی۔ ہمارے کتّوں کے آگے دودھ رکھا گیا۔ زینو کے بھائی ہمارے دوست بن گئے۔ اُنہیں جب پتہ چلا کہ اُن کی بہن کو خوشے نے پانی سے نکالا ہے تو خوشے کو وہ سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔

تقریباً تین گھنٹوں بعد ہمیں بتایا گیا کہ زینو ہوش میں آگئی ہے اور ہنستی بھی ہے۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ اُسے کس نے بچایا ہے۔ اُس کی ماں بیٹھک میں آگئی اور اُس نے خوشے کے گالوں اور سر کو بے تابی سے چوما۔ ہمیں یہ خوشی تھی کہ لڑکی بچ گئی ہے۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ ہمیں رات اپنے ہاں مہمان رکھیں گے۔ ہم نے اُنہیں بتایا کہ وہ ہم پر یہ ظلم نہ کریں ورنہ ہماری مائیں کپڑے دھونے والے ڈنڈے اُٹھائے یہاں آجائیں گی۔ بہرحال اُنہوں نے اجازت دے دی۔

زینو کا بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ خوشے نے بتایا کہ وہ اس جگہ سے واقف تھا۔ اُس کی ایک بہن کے سسرال اسی علاقے کے ایک گاؤں میں تھے۔ وہاں وہ کئی بار گیا تھا۔ اس گاؤں کے لوگوں نے اُسے چار سال پہلے کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اس جگہ ڈوب گیا تھا۔ دو جوان سال آدمیوں نے اُس کی لاش غار میں سے نکالی تھی۔ خوشے کو معلوم تھا کہ یہاں پانی نے چٹان کو کاٹ کاٹ کر چوڑا غار بنا رکھا ہے۔ وہ اسی لیے پانی میں کُود گیا تھا۔

اُس نے بتایا کہ وہ پانی میں ڈبکی لگا کر آگے گیا تو ہمیں خبردار کرنے کے لیے اُبھر آیا کہ ہم میں سے کوئی پانی میں نہ اُترے۔ اُس نے دوسری ڈبکی لگائی اور غار کی طرف گیا۔ اُس کے ہاتھ میں لڑکی کی ٹانگ آگئی جو اُس نے پکڑ کر گھسیٹ لی۔ لڑکی کی کچھ زندگی لکھی تھی اس لیے سبب بن گیا۔ ہم حیران تھے کہ لڑکی پانی میں اتنی دیر زندہ کیسے رہی۔

دوسرے دن زینو کا باپ، چچا، تایا، ایک ماموں اور بڑا بھائی ہمارے گاؤں میں آئے۔ اُن کے ساتھ زینو کی ماں بھی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ خوبصورت لگتی تھی۔ یہ لوگ خوشے کے لیے نئے کپڑے لائے تھے۔ ہم سب زینو کے

باپ وغیرہ کے پاس جا بیٹھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ زینو کس طرح ڈوبی اور اُس کے ساتھ کیا ہُوا تھا۔ تیرنے کے شوق میں اُس نے چٹان پر چڑھ کر تالاب میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ پانی کے اندر چلی گئی اور پانی کے نیچے تیرتی چٹان کے غار میں چلی گئی۔ اُبھری تو اُس کا سر اُوپر نہ لگا کیونکہ اُس نے ہاتھ اُوپر کر رکھے تھے۔ ہاتھ غار کی چھت سے لگے۔

وہ جوان اور بڑی اچھی صحت کی لڑکی تھی۔ اُس نے ہوش ٹھکانے رکھے اور باہر نکلنے لگی۔ اُوپر اٹھی تو اُس کے ہاتھ جو اُس نے اُوپر اٹھا رکھے تھے پھر چھت سے لگے آخر اُس کا دم ٹوٹنے لگا۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ یہ معجزہ تھا۔ زینو کو خدا نے زندہ رکھنا تھا۔ اُس بچّی نے جو زینو کی خالہ زاد بہن تھی، کس طرح محسوس کر لیا تھا کہ زینو ڈوب رہی ہے؟ خدا نے اس بچّی کو سبب بنایا کہ وہ کسی کو پکارے۔ زینو پانی کے اندر بے ہوش ہو چکی تھی۔ خوشا فوراً اُس تک جا پہنچا اور اُسے نکال لایا۔

زینو کی ماں زندہ دل اور دل گُردے والی عورت تھی۔ اُس نے خوشے کی ماں سے کہا کہ وہ اُس کے گھر آئے اور خوشے کو ساتھ لائے۔ تین چار روز بعد خوشا اپنی ماں اور باپ کے ساتھ زینو کے گاؤں چلا گیا۔ اُس نے واپس آکر دو باتیں بتائیں ایک یہ کہ زینو کی ماں اُس کی بہت ممنون ہے اور اُس کے ساتھ بہت پیار کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ زینو اُس سے زیادہ خوبصورت ہے جتنا ہم سمجھے تھے۔

خوشے کو اُنہوں نے اندر بٹھایا تھا۔ اُس نے بتایا کہ زینو اُسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی ہے اور یہ مسکراہٹ ویسی نہیں تھی جیسے لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر رسمی طور پر مسکراتے ہیں۔ زینو نے اپنے ہاتھوں خوشے کو دودھ کا پیالہ دیا تھا۔ ایک بار زینو کو موقع مل گیا۔ اُس نے خوشے کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا — "آتے رہنا۔ میں بھی آؤں گی۔"

خوشا اچھے خاندان کا جوان تھا۔ اُسے لڑکی کی یہ بات اچھی لگی لیکن اُس نے دل میں بدنیتی نہ آنے دی۔ ہمیں آکر یہ بات سنائی اور کہنے لگا کہ لڑکی کا اگر چال چلن داغدار نہ نکلا تو وہ اُس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ چال چلن پر شبہ اس لیے تھا کہ لڑکی کے باپ نے کہا تھا کہ وہ کھیلنے کُودنے کی شوقین ہے اور خوش طبع ہے۔

سات آٹھ روز بعد زینو، اُس کی ماں اور قریبی رشتے کی دو عورتیں ہمارے گاؤں خوشے کے گھر آئیں۔ میں نے زینو کو بڑی بُری حالت میں دیکھا تھا۔ اُسے جب پانی سے نکالا گیا تھا، اُس کا رنگ زرد تھا اور وہ بے ہوش تھی۔ اس حالت میں بھی پتہ چلتا تھا کہ وہ خوبصورت ہے لیکن وہ ہمارے گاؤں میں آئی تو پتہ چلا کہ اُس کے حُسن کا اور اُس کے جسم کی دلکشی کا جواب نہیں۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

زینو کی ماں تو خوشے پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے زینو سے جو پیار ہے وہ اپنے چاروں بیٹوں سے نہیں۔ اُس نے خوشے سے کہا تھا — "تم نے زینو کو نہیں، مجھے ڈوبنے سے بچایا ہے۔"

خوشے اور زینو نے ایک آدھ منٹ کے لیے تنہائی میں بات کرنے کا موقع پیدا کر لیا۔ پھر اُنہوں نے ملاقات کی ایک جگہ مقرر کر لی۔ یہ ایک خانقاہ تھی جو ہمارے اور زینو کے گاؤں سے برابر فاصلے پر تھی۔ زینو وہاں جاتی رہتی تھی۔ اُس کے گاؤں کے چوکیدار کی بیوی اُس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اگلی جمعرات کو خوشا اور زینو خانقاہ پر ملے۔ دونوں نے چوکیدار کی بیوی کو پیسے دے کر اُس کا منہ بند کر دیا۔ اس ملاقات میں خوشے نے زینو سے کہا کہ وہ پاک محبت لے کر آیا ہے اور پاک محبت چاہتا ہے۔ خوشے نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا۔

زینو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کہا — "میری منگنی ہو چکی ہے۔ منگنی نہیں ٹوٹ سکے گی۔"

خوشے کو بہت صدمہ ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اُس نے کہا "تم نے دیکھا ہے کہ تمہاری بے جی مجھے کتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔ میں اُسے کہوں گا.... تم بھی اُسے کہنا۔ شاید مان جائے۔"

"تم جانتے نہیں خوشے منگنی توڑنے کا نتیجہ کیا ہے؟" — زینو نے کہا — "مردوں کے سر کُھل جائیں گے۔"

زینو نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے ہاں لڑکے والوں کو کسی لڑکی کے رشتے سے جواب مل جائے تو خونی دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔ لڑکی والے منگنی توڑ دیں

تو لڑکے والے مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں خون خرابہ ہو جایا کرتا تھا۔

اگر میں آپ کو صرف عشق و محبت کی کہانی سنا رہا ہوتا تو خوشے اور زینو کی رومانی باتیں پوری تفصیلات سے سناتا۔ میری کہانی کچھ اور ہے۔ خوشے اور زینو کی محبت کے متعلق میں اتنا ہی بتانا کافی سمجھوں گا کہ خوشا رات کو کبھی کبھی اتنا زیادہ فاصلہ طے کر کے زینو کے گاؤں کے باہر پہنچ جاتا اور زینو وہاں آ جاتی۔ خوشا زینو کے گاؤں سے اُس کے چال چلن کی رپورٹ لے چکا تھا۔ زینو اخلاق اور چال چلن کی بڑی پکّی اور بالکل پاک صاف تھی۔ ایک بار خوشے نے اُسے کہا تھا کہ اُن کی شادی نہیں ہو سکتی چلو بھاگ چلیں۔

"یہ ارادہ دماغ سے نکال دو" — زینو نے اُسے جواب دیا — "میں زہر کھا کر قبر میں اُتر جاؤں گی، اپنے خاندان اور اپنے باپ کے منہ پر کالک نہیں ملوں گی۔"

خوشے کی ماں اور زینو کی ماں کی دوستی پکّی ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسری کے ہاں آتی جاتی رہتی تھیں۔

"خالہ!" — ایک روز جب زینو کی ماں خوشے کے گھر آئی ہوئی تھی، خوشے نے اُسے کہا — "کیا تمہارا پیار اور کیا تمہاری دلیری! تم نے مجھے بیٹا بنایا ہے اور میں نے تمہیں ماں کہا ہے۔ میری دلی مراد پوری کر دو۔"

زینو کی ماں بچی نہیں تھی۔ سمجھ گئی۔ اُس نے خوشے کو اُس کی ماں کی موجودگی میں بتایا کہ وہ زینو کی منگنی کر چکی ہے جو توڑی تو فساد ہو جائے گا۔ خوشے نے ایسی جذباتی باتیں کیں کہ اُس کے آنسو نکل آئے اور زینو کی ماں نے اُسے گلے لگا لیا۔

"تمہاری بیٹی کو پانی کی جس گُف سے نکالا تھا میں اُسی گُف میں ڈوب مروں گا" — خوشے نے کہا — "میرا دل نہ توڑو۔ منگنی توڑ دو۔ ہم سنبھال لیں گے۔"

زینو کی ماں نے آہ بھری اور بولی — "زینو میرے ساتھ ایسی ہی باتیں کر چکی ہے۔ میری تو بھوک اور نیند ماری گئی ہے۔"

خوشے نے ہمیں بتایا کہ بولتے بولتے زینو کی ماں چُپ ہو گئی۔ ایسے لگتا

تھا جیسے اب نہیں بولے گی۔ ذرا دیر چُپ رہ کر اُس نے سر کو زور سے اِدھر اُدھر ہلایا اور جوش سے بولی ــــ "خوشے پُتر! تم نے کہا ہے، کیا تمہارا پیار اور کیا تمہاری دلیری۔ اب دیکھ لینا میرا پیار بھی اور میری دلیری بھی۔"

زینو کی ماں معمولی عورت نہیں تھی۔ اُس نے اُس لڑکے کے خاندان کو جس کے ساتھ زینو کی منگنی ہو چکی تھی، ایک ناٹک کھیل کر بدنام کر دیا۔ خود ہی ایک بات پیدا کر لی۔ اپنے گاؤں کی ایک بڑی چالاک میراثن کو پیسے اور کپڑے دے کر بتایا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ میراثن نے زینو کے منگیتر کو ایک بڑی خوبصورت ہندو لڑکی کی جھلک دکھا کر اپنے جال میں پھانسا اور زینو کی ماں نے میراثن کی اطلاع پر زینو کے منگیتر کو عین موقع پر پکڑوا دیا۔ گاؤں میں اچھا خاصہ ہنگامہ ہُوا۔ اس کے نتیجے میں زینو کے باپ نے منگنی توڑ دی۔

لڑکے والوں نے دھمکی دی کہ زینو کی ڈولی کہیں اور نہیں جائے گی اور وہ لوگ بارات پر بارات لائیں گے۔ آپ نے یہ تماشہ پہلے کبھی سنا ہو گا۔ میں نے اپنی زندگی میں تین بار یہ تماشہ دیکھا ہے۔ لڑکی والوں نے منگنی توڑ دی اور لڑکی کا رشتہ کسی اور کو دے دیا۔ بارات آئی تو سابق منگیتر کے لواحقین بھی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر بارات لے آئے۔ ایسے دو موقعوں پر ڈانگ سوٹا چلا اور پولیس نے آکر صلح صفائی کرائی اور ایک موقع پر پولیس پہلے ہی پہنچ گئی اور جعلی بارات کو واپس کیا۔ ایسے واقعات اب بھی دیہات میں ہوتے ہیں۔

بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق اُدھر منگنی ٹوٹی اِدھر خوشے کی ماں میری ماں اور میرے ایک اور دوست کی ماں کو ساتھ لے کر زینو کا رشتہ مانگنے چلی گئی۔ رشتہ طے ہو گیا۔ زینو کا باپ اور بھائی پہلے ہی خوشے کو دل سے پسند کرتے تھے۔ جَٹ منگنی ہو گئی۔ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ پٹ بیاہ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ بھی طے ہو گیا۔ دن مقرر ہو گیا۔

زینو کے سابق منگیتر کا گاؤں زینو کے گاؤں سے ایک میل کے لگ بھگ دُور تھا۔ شادی کے دن سے دو روز پہلے زینو کا بڑا بھائی ہمارے گاؤں آیا۔ اُس نے خوشے کے باپ کو بتایا کہ سابق منگیتر کے باپ نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ شادی والے دن اپنے بیٹے کی بارات لائے گا۔ تیار رہنا۔ زینو کا بھائی مشورہ لینے آیا تھا کہ پولیس کو اطلاع دی جائے یا جو بھی صورت پیدا ہوتی ہے اُسے خود سنبھالا جائے۔

اُس زمانے میں باہمی پیار محبت اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ گاؤں میں کسی پر کوئی مشکل یا مصیبت آپڑتی تو گاؤں کا بچہ بچہ اُس کی مدد کو پہنچتا تھا۔ اب تو خود غرضی کا ایسا زمانہ آیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے لیے مشکل اور مصیبت پیدا کرتے ہیں۔

خوشے کے باپ نے ہمارے باپوں کے ساتھ بات کی۔ سب نے کہا کہ پولیس کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں، ہم خود نمٹ لیں گے۔ پتہ چلا کہ سابق منگیتر کے رشتہ داروں میں اتنے مرد نہیں جتنے زینو کے رشتہ داروں میں ہیں۔ دیہات میں طاقتور خاندان وہ ہوتا ہے جس میں مرد زیادہ ہوں۔ وہ لٹھ باز ہوں اور روپیہ پیسہ ہو۔ زینو کے خاندان اور قریبی رشتہ داروں میں یہ طاقت موجود تھی۔ اِدھر ہمارے گاؤں کے جوانمرد تیار ہو گئے۔ زینو کی ڈولی لانا ہمارے پورے گاؤں کا مسئلہ تھا۔

ہم جو گاؤں کا نوجوان طبقہ تھے، اپنی سکیم بنا رہے تھے۔ اس کے لیے ہمیں بارات کے ساتھ اپنے کُتے لے جانے کی ضرورت تھی۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں اجازت دے دی۔

اور بارات کی روانگی کا وقت آگیا۔ بارات ڈھولوں اور شہنائیوں کے ساتھ چلی۔ باراتی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے اور بارات کے ساتھ ایک درجن کُتے تھے۔ بارات زینو کے گاؤں میں پہنچی۔ تقریباً نصف گھنٹہ بعد ڈھولوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ زینو کے رشتہ دار اور ہم سب تیار ہو گئے۔ ڈھول قریب آرہے تھے۔ کسی نے اطلاع دی کہ سابق منگیتر کی بارات گاؤں کے قریب آگئی ہے۔ ہم تمام باراتی اور زینو کے رشتہ دار گاؤں کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ بارات دیکھی۔ اس کے ساتھ بیس پچیس آدمی تھے۔ جعلی دُلہا گھوڑے پر سوار تھا۔ ہماری نفری ساٹھ سے زیادہ تھی۔

بارات ہم سے بیس بائیس قدم دُور آرُکی اور ایک باراتی نے للکار کر کہا ــــ "ڈولی گاؤں سے باہر نہیں جائے گی۔"

گاؤں کے دو بوڑھے آدمی جنہیں بڑھاپے نے اچھی طرح چلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا، آگے گئے اور اُن لوگوں کو سمجھایا بجھایا کہ خون خرابے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ صلح صفائی سے واپس چلے جائیں، لیکن اُن لوگوں پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ للکارتے رہے۔ دُلہا کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ میں اور میرے دو دوست اپنے اپنے کُتّے ساتھ لے کر دُلہا کی طرف یہ کہتے ہوئے گئے کہ ہم نہیں لڑنا چاہتے اور وہ شرارت نہ کریں۔

دُلہا نے ہمیں للکارا۔ ہمارے کُتّے اشارے سمجھتے تھے۔ ہم اب دُلہا میاں کے گھوڑے کے پاس کھڑے تھے۔ سب سے پہلے میرے دوست راجہ شہباز خان نے جعلی دُلہا کے گھوڑے کی طرف اشارہ کر کے کُتّے کو تھپکی دی اور زنجیر کھول دی۔ کُتا گھوڑے پر بھونکنے لگا۔ میں نے اپنا کُتا چھوڑ دیا۔ میرے دوسرے دوست نے اپنے کُتّے کی زنجیر کھول دی۔ تین کُتّے گھوڑے کے ارد گرد دوڑنے اور بھونکنے لگے۔ گھوڑا بدکا۔ اُدھر سے ہمارے تمام دوستوں نے کُتّے چھوڑ دیئے۔ گھوڑا بے لگام ہو کر بھاگ اُٹھا۔ کُتّے اس کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ دُلہا واویلا بپا کئے ہوئے تھا۔ وہ گھوڑ سواری میں اناڑی تھا۔

جعلی باراتیوں نے دیکھا کہ اُن کا لاڈلا گر پڑے گا تو وہ سب گھوڑے کی طرف دوڑ پڑے۔ آگے کھڈ نالے تھے۔ گھوڑا ان میں غائب ہو گیا۔ اب ہمیں یہ پریشانی ہوئی کہ وہ لوگ کُتّوں کو ماریں گے۔ ہم سب اُدھر کو دوڑے۔ دیکھا کہ باراتی کُتّوں کو پتھر مار رہے تھے۔ ہم نے اپنے کُتّوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ ہم ڈرتے آگے نہیں جاتے تھے کہ وہ لوگ ہم پر حملہ کر دیں گے۔ ہمیں گھوڑا دُور گھاٹی چڑھتا نظر آیا۔ کُتّے اُس کے پیچھے نہیں تھے۔ بارات کُتّوں کے پیچھے بکھر گئی تھی۔ ہمارے پیچھے پیچھے ہمارے تمام آدمی اور گاؤں کے آدمی آگئے۔

ہم نے بڑی مشکل سے کُتّوں کو پیچھے بلایا اور گاؤں میں آئے۔ سب سے پہلے نکاح پڑھا گیا۔ گاؤں والوں نے اپنے بہت سے آدمی گاؤں کے باہر کھڑے کر دیئے تھے۔ اُس وقت کے رواج کے مطابق بارات کو رات بھر کے لیے رُکنا تھا۔ رات کو بھی گاؤں کے اِرد گرد پہرہ رہا اور اگلی صبح ہم زینو کی ڈولی لے کر اپنے گاؤں آگئے۔ ہمارے کُتّوں نے زینو کے سابق منگیتر کی بارات کو ایسے طریقے سے رخصت کیا تھا کہ اُن لوگوں کو پھر اِدھر آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پھر زینو ہمارے گاؤں کی رونق اور گاؤں کی عزّت بن کے رہی۔ خوشا ہماری شکاری ٹیم کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ چند ایک دلچسپ اور خوفناک واقعات ہوئے۔ یہ پھر کبھی سناؤں گا۔ ایک بات پر ہم اُس وقت ہنسا کرتے تھے۔ اب وہ بات یاد آتی ہے تو آنسو نکل آتے ہیں۔ زینو خوشے کو شکار پر جانے سے روکا کرتی تھی۔ وہ زینو کو ٹال دیتا تھا۔ زینو تھک ہار کر اُسے ہر بار کہا کرتی تھی ——"اچھا پھر اُس ڈھن کی طرف نہ جانا"—— تمام عمر زینو پر ڈوبنے کا خوف طاری رہا۔

پھر اُن کے بچّے پیدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے لڑکا پیدا ہُوا جس کا نام عبدالقدوس رکھا گیا۔ خوشے کے باپ نے جو ریٹائرڈ صوبیدار میجر تھا، کہا کہ یہ بچّہ فوج میں جائے گا اور صوبیدار میجری پنشن آئے گا۔ دادا نے دراصل خوشی کا اظہار کیا تھا۔ پاکستان کی فوج میں آج بھی پوٹھوہاریوں کی اکثریت ہے۔ اُس زمانے میں تو دیہات کا ہر جوان خواہ وہ کتنے ہی امیر باپ کا بیٹا ہو فوج میں جایا کرتا تھا۔ میں جنگِ عظیم دوم کے وقت کی بات کر رہا ہوں۔ عبدالقدوس جنگ کے دوران پیدا ہُوا تھا۔ بچّہ اپنی ماں اور اپنے باپ کی طرح خوبصورت تھا۔

زینو نے دو لڑکیوں کو جنم دیا جن میں سے صرف ایک زندہ رہی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ قدوس اپنے باپ کی طرح نکل آیا اور جوانی میں آکر اپنے باپ کی تصویر بن گیا۔ وہ جب اٹھارہ سال کا ہُوا تو فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اب فوج انگریز کی نہیں، پاکستان کی اپنی فوج تھی۔ ہمارے لڑکے اُچھلتے کودتے بھرتی ہونے جاتے تھے۔ ہمارے علاقے کے لوگوں کے دماغوں پر کشمیر سوار تھا۔ بڑوں کی چنڈال چوکڑیوں میں کشمیر کا ذکر اُسی طرح ہوتا تھا جس طرح پہلی جنگِ عظیم میں ہم لوگ ترکوں کا نام عقیدت اور احترام سے لیا کرتے تھے۔ میں اُس وقت چھوٹا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے کہ ہمارے گاؤں کے لوگ ترکی جانے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہم پاکستان بننے کے بعد "کشمیر بزورِ شمشیر" کی جوشیلی اور جذباتی باتیں کیا کرتے تھے۔

اب ہم اپنے لڑکوں کو فوج میں بھیج کر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ ہماری جوانی پیچھے کہیں رہ گئی تھی۔ ہمارا شکار بڑی دلچسپ، بڑی پیاری اور کئی دردناک یادوں کا مجموعہ بن گیا تھا جو ہم جوانی کے یار دوست ایک دوسرے کو سناتے اور سُنتے رہتے تھے۔

۱۹۶۵ء کا سال آگیا۔ خوشے اور زینو کا بیٹا عبدالقدوس لانس نائک بن چکا تھا۔ خوشے کا باپ کبھی کا مر گیا تھا۔ حادثہ یہ ہُوا کہ خوشا بھی مر گیا۔ زینو کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ ہو گی لیکن بڑھاپا اُس کے حسن کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ خوشا دنیا سے اُٹھ گیا تو زینو کا یہ حال ہو گیا جیسے کسی نے جلتے دیئے کو پھونک مار دی ہو۔ اُس کی بیٹی دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ ہر صبح خوشے کی قبر پر جانا زینو کا معمول بن گیا یا وہ اپنے بیٹے قدوس کے خط کا یا اُس کے چھٹی پر آنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

باتیں ایک ہی بار بے شمار یاد آگئی ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنے ذہن کو اس کہانی پر قائم رکھ رہا ہوں۔ ایک ایک لمحہ یاد آگیا ہے۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ کون سی بات سناؤں اور کون سی گول کر جاؤں۔ آئیے، میں آپ کو کئی باتیں گول کر کے لانس نائک قدوس تک لے جاتا ہوں۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح جب ہندوستان نے لاہور پر حملہ کیا اُس وقت قدوس کی انفنٹری رجمنٹ سیالکوٹ میں تھی۔ پھر ۸ ستمبر کو سیالکوٹ پر بھی ہندوستان نے حملہ کر دیا۔ ہمارے گاؤں کے چھبیس جوان فوج میں تھے۔ ہم بوڑھے اپنی جوانی کو آوازیں دینے لگے۔ ہماری جوانی کتوں، گیدڑوں اور خرگوشوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزر گئی تھی۔ اپنے وطن کی عزت بچانے کا وقت آیا تو ہم بوڑھے ہو چکے تھے۔ ہم محاذوں پر تو نہ جا سکے، اپنا ایک محاذ قائم کر لیا۔ میرے گاؤں کے آدمی خون دینے کے لیے راولپنڈی گئے۔ دفاعی فنڈ میں اتنا دیا کہ اپنے گھر خالی کر دیئے۔

زینو اپنے سونے کے کڑے دفاعی فنڈ میں دینے کے لیے لے آئی۔ اُس نے نقد رقم بہت دی تھی۔ گندم کی کئی بوریاں زینو نے فوج کو دی

تھیں۔ وہ مربعوں کی مالک تھی۔ اُس کے ہاں کوئی کمی نہیں تھی لیکن ہم نے اُس کے کڑے نہ لیے۔ وہ آخر بیوہ تھی اور اُس کا زیور اُس محبت کی یادگار تھی جو اُس نے خوشے سے کی تھی۔

فوج میں ہمارے جو جوان تھے انہیں ہم کہا کرتے تھے کہ لڑکو، ہم گیدڑوں کا شکار کھیلتے رہے ہیں، تم یاد رکھنا کہ تمہیں ہندوؤں کا شکار کھیلنا ہے۔

اب وہ ہندو آگیا تھا اور توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ساتھ آیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں قرآن خوانی ہر وقت ہوتی رہتی تھی ——— اپنے نوجوانوں کی زندگی کے لیے نہیں بلکہ اُن کی فتح کے لیے ——— پھر گاؤں میں پہلے شہید کی لاش آئی۔ اللہ تیری شان۔ دُور دُور کے گاؤں کے لوگ ہمارے گاؤں پر ٹوٹ پڑے۔ جنازہ اتنا بڑا جو کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔

پھر دوسرے شہید کی لاش آئی ——— یہ خوشے اور زینو کے بیٹے لانس نائک عبدالقدوس کی لاش تھی ——— آپ جانتے ہوں گے کہ فوج میں "بولو نعرۂ حیدری۔ یا علیؓ" ——— کا نعرہ بہت مقبول ہے۔ جب عبدالقدوس کا تابوت آیا تو زینو نے باہر نکل کر نعرہ لگایا ——— "نعرۂ حیدری۔ یا علیؓ" ——— اور وہ بازو لہرا لہرا کر چلّانے لگی ——— "میرا دُلہا آگیا۔ میرا دُلہا بیٹا آگیا" ——— پھر وہ بڑی بلند آواز سے اعلان کرنے لگی ——— "کوئی نہیں روئے گا۔ میرے دُلہے بیٹے پر کوئی نہیں روئے گا۔"

یہ حقیقت ہے کہ زینو کی آنکھ میں کسی نے آنسو نہ دیکھا لیکن وہ بیٹھے بیٹھے نعرہ لگاتی ——— "نعرۂ حیدری۔ یا علیؓ" ——— اُس کا دُلہا بیٹا دفن ہو گیا۔ اب وہ آدھا دن قبرستان میں اپنے خاوند اور اپنے بیٹے کی قبروں پر گزارنے لگی۔ ہم جو خوشے کے جوانی کے دوست تھے، زینو کے پاس جا بیٹھتے اور خوشے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ اپنے ڈوبنے کا اور خوشے کی ہمت سے بچ نکلنے کا واقعہ وہ ہمیں یوں سنایا کرتی جیسے ہم پہلی بار سُن رہے ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کی شہادت کا واقعہ سننے کو بے تاب تھی لیکن اُس کے بیٹے کا کوئی ساتھی چھٹی نہیں آیا تھا۔

ہمارے گاؤں کے چھ جوان شہید ہوئے۔ ریڈیو پر اعلانِ تاشقند سنا تو ہمارے گاؤں میں ماتم کی فضا پیدا ہو گئی۔ ہمارے گاؤں میں ایک کمہار ہُوا کرتا تھا۔ دس سال گزرے مر گیا ہے۔ اُس نے سنا کہ ہندوستان کے ساتھ صلح صفائی ہو گئی ہے اور فوجیں واپس آ رہی ہیں تو اُس نے کہا ”آج ہمارے شہید بیٹے مر گئے ہیں۔“

یہ سوال تو ہر کسی نے ہر کسی سے پوچھا ”کشمیر کا کیا بنا؟“ — جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

جب فوجیں واپس آئیں تو فوجیوں کو چھٹیاں ملنے لگیں۔ عبد القدوس شہید کی رجمنٹ کے دو ساتھی چھٹی آئے۔ انہوں نے قدوس شہید کی شہادت کا واقعہ اس طرح سنایا کہ سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی جنگ ہوئی تھی جس کے لیے چونڈہ مشہور ہُوا۔ میں چونکہ فوجی نہیں ہوں اس لیے آپ کو یہ واقعہ فوجی زبان میں نہیں سنا سکوں گا۔ میری سمجھ میں جس طرح آئی تھی اسی طرح سنا دیتا ہوں۔

پاکستان کی آرمی میں ٹینک بہت کم تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پاکستان آرمی نے ”ٹینک شکار پارٹیاں“ بنا لی تھیں۔ اسے فوجی زبان میں TANK HUNTING PARTY کہا کرتے ہیں۔ رات کو ٹینک نہیں لڑ سکتے۔ شام کے بعد انہیں انفنٹری کے اگلے مورچوں سے پیچھے لے جاتے ہیں جہاں ٹینک محفوظ رہتے ہیں اور ان میں پٹرول اور ایمونیشن ڈالا جاتا ہے۔ رات کو ٹینک شکار پارٹیاں بھیجی جاتی ہیں جو دشمن کے مورچوں سے گذر کر یا دُور کا چکّر کاٹ کر پیچھے جاتی اور راکٹ لانچروں سے ٹینکوں کو تباہ کرتی ہیں۔ آپ شاید اندازہ کر سکتے ہوں گے کہ دشمن کے مورچوں کے علاقے سے جوان کس طرح پیچھے جاتے ہوں گے اور اپنا کام کر کے زندہ واپس کس طرح آتے ہوں گے۔ کیا دشمن خاموش بیٹھا رہتا ہو گا؟

قدوس ایسی ہی ایک ٹینک شکار پارٹی کے ساتھ گیا تھا۔ دشمن کے ٹینکوں نے جنگ کے پہلے دو تین دن قدوس کی رجمنٹ کا بہت نقصان کیا تھا۔ قدوس جس پارٹی کے ساتھ گیا اُس کا انچارج ایک حوالدار تھا۔ پارٹی آٹھ جوانوں کی تھی۔ دشمن کے مورچوں کے قریب جا کر پارٹی دو دو میں تقسیم ہو گئی اور ایک

نالے کے اُونچے کنارے کے ساتھ ساتھ آگے نکل گئی۔ جوان چھپتے، رینگتے بچتے بچاتے دشمن کے دو مورچوں کے درمیان سے گذر گئے۔

پارٹی نے چار ٹینک تباہ کر دیئے۔ دھماکے ہوئے، ٹینکوں کو آگ لگی۔ پارٹی کے جوان دشمن کے علاقے کے اندر تھے۔ دشمن نے روشنی راؤنڈ فائر کر کے رات کو دن بنا دیا اور مشین گنیں فائر ہونے لگیں۔ پارٹی کے جو جوان جس طرح اور جدھر سے نکل سکتے تھے نکلنے لگے۔ قدوس نکل آیا۔ دشمن کے مورچوں میں دو مشین گن پوسٹیں تھیں جہاں سے مشین گنیں مسلسل فائر کر رہی تھیں۔ قدوس خطرے سے نکل آیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو جوان تھا اُس نے بتایا کہ قدوس نے اُسے کہا کہ ہمارے معلوم نہیں کون کون سے ساتھی ابھی نہیں نکل سکے مشین گنیں فائر ہو رہی ہیں۔ میں ان دو مشین گنوں کو خاموش کر آؤں۔

قدوس کے ساتھی نے اُسے کہا کہ ہم اپنا کام کر چکے ہیں۔ حکم بھی یہی ہے کہ اپنا کام کرو اور نکلو، لیکن قدوس نہ مانا۔ اُس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ اُس کا انتظار کرے۔ قدوس پھر دشمن کے مورچوں کی طرف رینگنے لگا۔ اُس کا ساتھی ایسا نہیں تھا کہ اُسے یوں اکیلا جانے دیتا۔ وہ قدوس کے پیچھے چلا گیا۔ قدوس رینگتا ہُوا اور آگے بڑھ گیا اور ایک مشین گن پوسٹ کے قریب چلا گیا۔ دونوں مشین گنیں ہر طرف گولیوں کی بوچھاڑیں فائر کر رہی تھیں۔ قدوس نے اُٹھ کر گرینیڈ پھینکا۔ گرینیڈ وہیں جا پھٹا جہاں قدوس نے پھینکا تھا۔ ایک مشین گن خاموش ہو گئی۔

وہاں سے قدوس دوسری مشین گن کی طرف رینگنے لگا۔ وہ کچھ دُور تھی۔ روشنی راؤنڈ بھی فائر ہو رہے تھے۔ قدوس کے ساتھی نے بتایا کہ اُس کی ہمت نہ پڑی کہ قدوس کے ساتھ جاتا۔ وہ وہیں کہیں رُک گیا۔ قدوس نے دوسری مشین گن کو بھی اُڑا دیا۔ اُس کے ساتھی نے اُسے دوڑتے ہوئے پیچھے آتے دیکھا اور قدوس بیٹھ گیا۔ اُس کا ساتھی جُھک کر چلتا اُس تک پہنچا۔ روشنی راؤنڈ ابھی تک فائر ہو رہے تھے۔ اُن کی روشنی میں اُس نے دیکھا، قدوس کی وردی لال ہو گئی تھی اور لال خون چمک رہا تھا۔ قدوس صرف یہ کہہ سکا ”کوئی گولی شاید پیٹ میں سے گذر گئی ہے۔ ٹانگوں اور بازوؤں میں جو لگی ہیں ان کی پرواہ نہیں“ — پھر اُس

نے کراہتے ہوئے کہا — "دونوں گنوں کو چُپ کرا دیا ہے۔ میری ماں کو کہنا..."
اس سے آگے قدوس کی زبان رُک گئی۔

اُس کا ساتھی اُسے کندھے پر ڈال کر بڑی مشکل سے پیچھے نالے تک لے آیا۔ وہاں پارٹی کا کمانڈر حوالدار دو جوانوں کے ساتھ مل گیا۔ قدوس کے ساتھی نے حوالدار کو بتایا کہ قدوس نے کیا کیا ہے تو حوالدار نے کہا کہ اس شیر کو میں خود اٹھا کر پیچھے لے جاؤں گا۔ قدوس کو باری باری اُٹھا کر پیچھے لے آئے۔ اپنے مورچوں میں پہنچ کر دیکھا، قدوس شہید ہو چکا تھا۔ آٹھ جوانوں کی پارٹی میں سے یہی تین جوان اور ایک حوالدار زندہ واپس آئے تھے۔ باقی شہیدوں کی لاشیں دشمن کے علاقے میں رہ گئی تھیں۔ قدوس کے ساتھی نے بتایا کہ اس پارٹی نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔

باپ گیدڑوں اور خرگوشوں کا شکاری تھا اور وہ پہلے شکار پر زینو جیسی حسین لڑکی شکار کر لایا تھا لیکن بیٹا ٹینکوں کا شکاری نکلا۔

قدوس کی بہادری کی یہ کہانی اُس کی ماں کو سنائی گئی۔ اُس کی زبان پر ایک بات بیٹھ گئی — "وہ اپنی ماں کو کیا کہنا چاہتا تھا۔ یہی کہ میری ماں کو کہنا کہ روئے نہیں.... شاید کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ اُس نے ماں سے پانی مانگا ہوگا" — زینو کے پاس کوئی عورت یا مرد ذرا رُک جاتا تو وہ اُس سے یہی سوال پوچھتی — "میرے بیٹے کے دل میں کیا تھا جو وہ اپنی ماں سے کہنا چاہتا تھا؟"

زینو کی آنکھ میں کبھی آنسو نہ دیکھا گیا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ شہید پر آنسو بہاؤ تو اُس کی رُوح کو تکلیف ہوتی ہے لیکن آنسو جو زینو نے روکے ہوئے تھے وہ اُسے جلا رہے تھے۔ روز بروز اُس کا دماغ بگڑتا جا رہا تھا۔ وہ دن میں کئی بار "نعرۂ حیدری۔ یا علیؓ" — کا نعرہ لگاتی تھی۔ پھر رات کو کبھی کبھی اُس کے نعرے سنائی دینے لگے۔ بیٹے کی رُوح کو تکلیف سے بچانے کے لیے ماں نے اپنے آنسو پی پی کر اپنے آپ کو جلا لیا تھا۔ اگر وہ روتی تو اُس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

دو سال گزرے تو زینو کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنے کوٹھے پر چڑھ جاتی اور چلّا چلّا کر یا علیؓ کے نعرے لگاتی۔ کبھی منڈیر پر ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ جاتی۔ سر پہ

دوپٹہ نہ ہوتا اور وہ کچھ دیر نعرے لگا کر نیچے آجاتی۔ اُس کے نعرے ہمارے آنسو نکال دیتے تھے۔ ہمیں خوشا اور اُس کا شہید بیٹا قدوس نظر آنے لگتے۔ مجھے وہ وقت یاد آجاتا جب ہم زینو کی ڈولی لائے تھے۔ مجھے قدوس کی پیدائش یاد آجاتی۔ خوشے اور زینو نے اپنی شادی جیسی خوشی منائی تھی۔

میں اپنے بیٹوں کے پاس راولپنڈی آگیا۔ آٹھ نو ماہ بعد گاؤں گیا تو دیکھا کہ گاؤں کی عورتوں نے زینو کو "پہنچ والی فقیرنی" بنا رکھا تھا۔ مرد بھی زینو کی کرامات کو مانتے تھے۔ سب کہتے تھے کہ آدھے سر کا درد کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو، زینو پھونک مارتی ہے اور درد غائب ہو جاتا ہے۔ یہ شاید نفسیاتی اثر تھا یا گاؤں والوں کے دلوں میں زینو کا تقدس اتنا زیادہ اور عقیدت اتنی گہری تھی کہ اُس کی پھونک سے وہ اپنے سر کے درد کو بھول جاتے تھے۔

میں اُس کے پاس گیا تو وہ میرے گلے لگ گئی اور میرا ماتھا چُوم کر بولی۔
"میں آج قدوس اور خوشے سے ملی تھی۔ باپ بیٹا بہت خوش ہیں۔ تمہاری پوچھتے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ صابو آئے گا تو تمہارے پاس بھیجوں گی۔ تم اُن کے پاس جانا صابو!"

میں خوشے اور قدوس کے پاس گیا۔ دونوں قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ جب واپس اپنے گھر آیا تو زینو کے نعرے سنائی دینے لگے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا — "بے چاری پاگل ہو گئی ہے" — بیوی نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی — "کافروں والی باتیں نہ کیا کرو۔ خدا نے اسے کرامات دے کر اپنے سائے میں بٹھا لیا ہے"۔

میں آہ لے کر چُپ ہو گیا۔ اس سال کے آغاز تک زینو کے نعرے سنتا رہا۔ وہ ضعیف العمر ہو گئی لیکن نعرے لگاتے وقت اُس کی آواز میں جوانی کا جوش ہوتا تھا۔ اُسے لوگ شاید اس لیے "پہنچ والی فقیرنی" کہتے تھے کہ اُسے پاگل کہنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا تھا۔

آخر اُس کے نعرے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے اور اُسے خوشے اور قدوس شہید کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔